قومی زبان

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی ۱

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

اپریل ۱۹۸۸ء
جلد ۵۹
شمارہ ۴

مضمون نما

ادار یہ		۳
نوادر کتب خانۂ خاص	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴
گوشۂ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں		۵
اظہارِ خیال	ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں	۷
استاذ الاساتذہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۰
جیئے کرتا قیامت ...	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۵
آں کہ من دانم و داند دلِ من	ڈاکٹر نجم الاسلام	۲۷
استادِ محترم	ڈاکٹر نظر کامرانی	۳۱
اقبالیات		
سید وقار عظیم سے اقبالیات پر ایک مصاحبہ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۳۷
مجھے گھر یاد آتا ہے	آصف فرخی	۴۷
غزل نما		
شاہ تراب	ادا جعفری	۵۷
سر سید کا ایک غیر مطبوعہ خط	سلیم الدین قریشی	۶۵
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ ـ ایک مطالعہ	ڈاکٹر قاضی عبید الرحمٰن	۶۹
گلہائے رنگ رنگ		
ہرنی کی کہانی	حمید سندھی / آفاق صدیقی	۷۳
ترکی نظمیں	یونس امرے ، فضل حسن داغلرجہ	۷۷
تعلقات عامہ ـ قصۂ قدیم و جدید	نسیم احمد	۷۹
رفتارِ ادب		۸۵
گرد و پیش		۹۱
حروفِ تازہ		۹۵
نئے خزانے	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری	۹۷

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر معاون
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ .... ۵ روپے
سالانہ .... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ...... ۱۰۰ روپے

بیرون ملک
فی پرچہ .... ایک ڈالر
سالانہ .... دس ڈالر
سالانہ (رجسٹری سے) ... پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۷۲۳۰۲۳

انجمن کی ایک روایت یہ ہے کہ وہ ہر سال "بابائے اردو یادگاری لیکچر" کی تقریب کا اہتمام کرتی ہے اور جو مقالہ اس میں پڑھا جاتا ہے اسے کتابی صورت میں چھاپ دیتی ہے تاکہ عام قارئین بھی اس سے مستفیض ہو سکیں۔ اس سلسلے کا پہلا مقالہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا "محمد تقی میر" تھا جو ایک عرصہ ہوا انجمن سے چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جالبی صاحب کے علاوہ یادگاری لیکچر میں سال بہ سال جن بزرگ ادبا نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر ریاض الحسن، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

رواں مالی سال کے لیے چار توسیعی لیکچروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پہلا لیکچر ڈاکٹر وحید قریشی نے "جدید اردو تحقیق" کے موضوع پر دیا، دوسرا لیکچر ۲۶ مارچ کو جناب عزیز حامد مدنی نے "جدید اردو شاعری" کے موضوع پر دیا۔ یہ لیکچر عنقریب کتابی شکل میں شائع ہوگا۔ تیسرا لیکچر ڈاکٹر وزیر آغا کا ہوگا۔ اس کا موضوع "جدید اردو تنقید" ہے۔ چوتھا لیکچر قلندر بخش جرأت کے بارے میں ہوگا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی یہ لیکچر دیں گے۔ یہ دونوں لیکچر بھی کتابی شکل میں شائع ہوں گے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

نوادرِ کتب خانۂ خاص

"تواریخ

راسلس شہزادہ حبش کی جس کو عالم منبحہ جانسن نے تصنیف کیا ــــ سنہ ۱۸۳۹ مسیحی"

ایک غلطی کی تصحیح

مارچ ۸۸ء کے "قومی زبان" میں مذکورہ بالا کتاب کے تعارف میں سہواً مترجم سید محمد میر کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا تھا۔ جناب مشفق خواجہ کے توجہ دلانے سے واضح ہوا کہ سید محمد میر حسن کا نام کمال الدین حیدر تھا۔ اپنے عہد کی معروف علمی شخصیت اور قیصر التواریخ کے جامع تھے۔ قیصر التواریخ مشہور برطانوی افسر اور مورخ سر ہنری ایلیٹ کے ایما پر جو (تاریخ ہند ــ بقول مورخین ہند") کے ایک مولف تھے، مرتب کی گئی تھی۔ مہاراجہ دگ بجے سنگھ نے قیصر التواریخ کی تقریظ میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی علوی نہاد لکھنوی نژاد متوکل بر مشیت رب قدیر عرف سید محمد میر منگنی کم بلائے خدا بخش والی کہ مولد و مسکن آبائی ان کا خطہ بے خطائے لکھنؤ ہے۔ اور دربار شاہی سے تعین عہدہ ہائے جلیلہ تزاید آبرو اور حکام حال میں بھی لحاظِ عزت و توقیر بلا گفتگو ہے اور بہ وفورِ لیاقت و قابلیت ذہن رسا کو ہمیشہ سن تمیز سے جستجوئے کوائفِ روزگار میں صرف کیا"

قیصر التواریخ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ دونوں جلدیں نول کشور پریس لکھنؤ اور کانپور سے شائع ہوئی تھیں۔ کتب خانۂ خاص میں پہلی جلد کے تیسرے ایڈیشن کے دو نسخے ہیں جو نومبر ۱۹۰۷ء میں کانپور میں طبع ہوئے تھے۔ جلد دوم ۱۸۹۶ء کی مطبوعہ ہے۔ یہ اس کی دوسری اشاعت ہے۔

سید محمد میر کا ایک اور ترجمہ "مقاصدِ علوم" ہے۔ یہ LORD BROUGHAM کی کتاب "A TREATISE ON THE OBJECTS, ADVANTAGES AND PLEASURES OF SCIENCE" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۴۱ء میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں

ڈاکٹر نجم الاسلام
ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں
جناب نور الحسن جعفری
ڈاکٹر جمیل جالبی
ڈاکٹر اسلم فرخی

گوشۂ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

اظہارِ خیال

محترم بزرگو اور عزیزو !

میں آپ سب حضرات کا بہت ممنون ہوں کہ آج آپ نے مجھے اپنی ہم نشینی کا شرف بخشا اور فاضل مقرّرین نے اپنے کلماتِ تحسین سے نوازا۔ لیکن ان کلمات کی حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ یہ مقرّرین وہی حضرات ہیں جو میرے خاص کرم فرما ہیں۔ اس لیے اگر انھوں نے جوشِ محبّت میں میرے متعلق کچھ مبالغے سے کام لیا ہے تو آپ حضرات اس سے متاثر نہ ہوں بلکہ دعا فرمائیں کہ ان کے خیال کے مطابق مجھے کسی لائق بننے کی سعادت حاصل ہو جائے۔

میرے بزرگو اور عزیزو ! آج مجھے نواب صدّیق حسن خان مرحوم کی کتاب ابقاء المنن یاد آرہی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو انھیں عطا ہوئی تھیں۔ میں بھی تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے چند بزرگوں کی بعض باتیں اجمالاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں بھی ان باتوں کو اپنے لیے نعمت سمجھتا ہوں۔ شاید ہمارے نوعمر سامعین ان باتوں سے کوئی فائدہ حاصل کر سکیں۔ میں چھوٹا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا اس لیے والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی مرحوم کے زیرِ تربیت رہا۔ وہ مجھے رات کو تین بجے اٹھا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ دین اور دنیا کے کاموں کے لیے صبح کا وقت تہجّد سے فجر تک ہوتا ہے۔ پھر یہ نصیحت بھی تھی کہ تمام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے دعا کیا کرو اور کسی کے انتقال کی خبر ملے تو اس کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب بھی کیا کرو۔

مجھے بچپن ہی میں علی گڑھ بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بکثرت اساتذہ کی شفقتیں حاصل رہیں۔ لیکن چند بزرگ ایسے تھے جن سے خصوصی تعلق رہا۔ یعنی مولانا سلیمان اشرفؒ، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوریؒ، قاری ضیاء الدّین احمد الٰہ آبادیؒ، پروفیسر ضیاء احمد بدایونیؒ اور مولانا احسن مارہرویؒ۔ مولانا سلیمان اشرفؒ عصر کے بعد تفسیر پڑھاتے تھے اور مغرب کے بعد بخاری شریف۔ وہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلویؒ کے مرید اور خلیفہ بھی تھے لیکن ہمیشہ مولانا ابوبکرؒ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے جو دیوبندی تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ "قرآن بہت پڑھا کرو تاکہ تمہاری عربی کی قابلیت اچھی ہو جائے"۔ مولانا ابوبکر محمد شیثؒ فرمایا کرتے تھے کہ عربی خوب پڑھو۔ کیوں کہ عربی میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ علوم و فنون ہیں"۔ قاری ضیاء الدّین احمدؒ فرماتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اچھی امید رکھو اور مایوسی کو قریب نہ آنے دو"۔ پروفیسر ضیا احمدؒ کی خدمت میں یہ سبق ملتا تھا کہ "طبیعت کیسی ہی خراب ہو اپنا مطالعہ کبھی ترک مت کرو"۔ اور حضرت سعدیؒ کے لیے ان کے پیر حضرت شہاب الدّین سہروردیؒ کی جو

نصیحت تھی وہ بھی یاد دلاتے تھے کہ:

مرا پیر دانائے روشن شہاب ؒ · دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ در نفس خود بیں مباش · دگر آنکہ در جمع بد بیں مباش

مولانا احسن مارہروی ؒ کی نصیحت تھی کہ "رمضان المبارک میں شعر و شاعری سے بالکل تعلق نہ رکھو"۔
علی گڑھ ہی میں نواب حبیب الرحمٰن شروانی ؒ کی بھی شفقتیں حاصل ہوئیں۔ کئی مرتبہ حبیب گنج کے مخطوطات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ فرماتے تھے کہ "صرف مشکل کام کا انتخاب کرو، آسان کام مرد کو زیب نہیں دیتا"۔

علی گڑھ میں مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کی بھی تشریف آوری ہوا کرتی تھی۔ اسی زمانے سے ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں موسم گرما میں بعض حضرات (بالخصوص استاذی پروفیسر رشید احمد صدیقی ؒ) شیروانی کے ساتھ ہیٹ پہنا کرتے تھے۔ مولانا سے دریافت کیا کہ ہیٹ لگانا کیسا ہے؟ فرمایا کہ "سر پہ لگانے میں تو حرج نہیں، دل پر نہ لگایا جائے"۔ یہ تمام باتیں چھوٹی ہیں لیکن میرے لیے بہت بڑی ثابت ہوئیں اور مشعلِ راہ بھی بنیں۔ میں ان باتوں کو انعاماتِ الٰہیہ ہی سمجھتا ہوں۔

استاذی پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ؒ کی سخت کوشی کا ذکر اوپر آیا ہے۔ وہ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ادب میں تبحر رکھتے تھے۔ بلکہ عربی کے بعض قصائد جو مخطوطات میں میرے زیرِ مطالعہ تھے ان کی تصحیح کے لیے میں انہی کو زحمت دیا کرتا تھا جب کہ دوسرے فضلا اس کام کو ٹال جاتے تھے۔ استاذی موصوف ؒ ہی نے مجھے سید حسن غزنوی پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ سنائی غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ان کا ایک عربی شعر بہت مشہور ہے۔

سَلِّمُوا یَا قَوْمِ بَلْ صَلُّوا عَلَی الصَّدْرِ الْاَمِیْن · مُصْطَفٰی مَا جَاءَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْن

سید حسن غزنوی پر کام کرنا بہت دشوار تھا اور فارسی کے ایک مشہور محقق نے مجھے اس سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن نواب حبیب الرحمٰن شروانی ؒ نے مجھے ڈانٹ کر لکھا کہ "تم یہی کام کرو اور مرد بنو جیسے کہ ہو"، چنانچہ پھر میں نے یہی کام شروع کیا۔ اور اس سلسلے میں برِ صغیر کے اکثر معروف اور غیر معروف کتب خانے دیکھے۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس اور پیرس کے بعض مخطوطات کے عکس بھی حاصل کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ایسا کرم ہوا کہ مخطوطات کی مدد سے میں نے انگریزی میں تاریخِ بہرام شاہ غزنوی لکھی اور چھٹی صدی ہجری کے حسبِ ذیل شعرا پر تحقیقی مقالے لکھے:

برہانی، معزی، سید حسن غزنوی، حکیم سنائی، ادیب صابر، عبد الواسع جبلی، حکیم سوزنی، ازرقی، عمادی غزنوی، عثمان مختاری، نجیب الدین جرباد قانی، مجیر بیلقانی، رضی الدین نیشاپوری۔ پھر معلوم تبریزی، حسن مروزی، جلال ہروی، بیدل اور بعد میں حضرت مظہر اور صائب کے شاگرد ظہیر وغیرہ پر بھی لکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے اکثر مقالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مقالات ملک کے اردو اور انگریزی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں فارغ ہوا۔ چند ماہ بیکار رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے پبلک سروس کمیشن

کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں مقرر کیا۔ تین سال کے بعد ناگ پور یونیورسٹی نے مجھے صدرِ شعبۂ اردو منتخب کیا اور یہ منصب ۱۹۴۸ء تک قائم رہا۔ اس دوران ایسے انعاماتِ الٰہیہ بھی حاصل ہوئے کہ جن کا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب داستان تقسیمِ ہند سے پہلے کی ہے۔ اس کے بعد جو حالات اور واقعات رونما ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر میرے کرم فرما حضرات کو معلوم ہیں اس لیے ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو وہ وقت پیشِ نظر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ کسی کا مشہور شعر ہے کہ:

بیرونِ گور لافِ کرامت چہ می زنی ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

آخر میں آپ سب حضرات کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ گوشہ نشین اور ہیچ میرز و ہیچ مداں کو ایسی عزت بخشی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

پہلا بابائے اردو یادگار لیکچر ۱۹۸۰ء

محمد تقی میر

از

ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ڈاکٹر جمیل جالبی

استاذ الاساتذہ

استاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک اور ممتاز ہیں جن پر نہ صرف ہم سب فخر کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ وہ جامع الصفات ہیں۔ ایک ہی ذات میں اتنی صفات کا یکجا ہو جانا ایک ایسا کمال ہے جو اس دور میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ عظیم استاد ہیں۔ ایسے فاضل اور شفیق استاد جن کی مثال اس دور میں نہیں ملتی ان کے شاگرد اس برصغیر اور بیرونی ممالک میں افقِ علم و ادب پر چھائے ہوئے گیسوئے زندگی کو اس طور پر سنوار رہے ہیں کہ استاد کا فیض معاشرے کو روشن و منور کر رہا ہے۔ ایسے محقق و مفکر کہ ان کی تحقیقات نے ادب و فکر کے در و بام پر اُجالا کیا ہے۔ ایسے قطبِ اقطاب اور ایسے بزرگ ولی اللہ کہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ کو راستی کی طرف موڑ کر ان کی زندگی کو نیکی کے راستے پر لگایا ہے۔ جس پر توجہ کی پارس بن گیا۔ جسے نظرِ کیمیا اثر سے دیکھ لیا، کُندن ہو گیا۔ روشن آنکھیں، شگفتہ و خنداں نورانی چہرہ، صاف دھیما لہجہ دل میں اتر جانے والا، باتیں جیسے گلوں کی خوشبو۔ کم سخن لیکن ہر سخن میں معنی کا ایک در۔ یا۔ جب کبھی لقمہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کی لذتِ کام و دہن کا مستقل مزا بن گئی۔ چشمۂ فیض ایسا کہ ہر دم جاری ہے۔ جو آیا شاد کام گیا۔ بیمار آیا صحت مند گیا۔ درماندوں کے رفیق، دشمنوں کے دوست، سب کے لیے دعا گو۔ جب بھی دیکھنے کا موقع ملا عبادت گزاری میں دیکھا۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔ مزاجاً فقیر لیکن امیروں کے پیشوا۔ جو لفظ دل کی زبان سے نکلا مشرف بہ قبولیت ہوا۔ علم اتنا کہ بہت سے عالموں کے پاس مل کر نہ ہوگا۔ لکھائی ایسی کہ جیسے صفحۂ قرطاس پر موتی ٹانک دیے ہوں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت۔ فارسی و عربی پر پوری دسترس۔ خطوں کے جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے ہم آپ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ رسولؐ کے عاشق سنت کے پیروکار۔ شریعت و طریقت کے پابند۔ سلسلۂ نقشبند۔ یہ ہیں۔ میرے استاد۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ہادی بھی، راہنما بھی۔ اللہ تعالےٰ ایسے استاد سب کو دے۔ غالب نے کہا تھا اور وہی میں استاد کے لیے کہتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۲)

ڈاکٹر صاحب کی اب تک ساٹھ کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں علمی ادبی اور تحقیقی کتابیں بھی ہیں جیسے "سید حسن غزنوی"، جو عہدِ غزنوی پر پہلی بنیادی تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ "حالی کا ذہنی ارتقا" جس نے تحقیق میں

نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی پر اردو کا اثر، علمی نقوش، فارسی کے قدیم شعراء، تحقیقی جائزے، ادبی جائزے، تحریر و تقریر، متین ہمایوں پوری کے مرثیے۔ "ثقافتی اردو" تو ایک ایسی کتاب ہے کہ یہ موضوع اس انداز سے پہلی بار سامنے آیا ہے۔ "اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات" تحقیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ سندھی اردو لغت اور اردو سندھی لغت وہ لغات ہیں جو آج سے تیس سال پہلے تالیف کی گئی تھیں اور آج تک ان پر اضافہ نہ ہو سکا۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) وہ تصنیف ہے جو آج بھی استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال ان کا محبوب موضوع ہے۔ اور محبوب اس لیے ہے کہ اقبال کی شاعری میں انھیں روحِ اسلام کارفرما نظر آتی ہے۔ "اقبال اور قرآن" اور "معارفِ اقبال" جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین انھوں نے اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھ کر روحِ اقبال اور روحِ اسلام کو اجاگر کیا ہے۔ دیوانِ روشن اور دیوانِ عظیم تدوینِ متن کی ممتاز مثالیں ہیں۔ ادب و تحقیق کی طرح تصوّف ان کا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ان کی کم و بیش سینتیس ۳۷ تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں رسائلِ مشاہیرِ نقشبندیہ، ملفوظاتِ صوفیہ، ارشادِ رحیمہ، ہدایت الطالبین، تحفۂ زواریہ، وسیلۃ القبول، اثبات النبوۃ، رسالہ تہلیلیہ، مکاشفاتِ عینیہ، تاریخِ اسلاف، سوانح امیر کلال، سعید البیان، گلشنِ وحدت، مکتوباتِ سیفیہ، مجمع البحرین، رسالۂ سلوک، لوایح خانقاہِ مظہریہ، سراجِ منیر اور تین تین ضخیم جلدوں میں مکتوباتِ امام ربّانی اور مکتوباتِ معصومیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً حضرات القدس، خزینۃ المعارف، اور زبدۃ المقامات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ انگریزی میں ان کی دو کتابیں "تاریخ بہرام شاہ غزنوی" اور "برصغیر میں فارسی ادب" قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ لغت پر ایسا عبور کہ ماہرینِ فن ان کی رائے کے محتاج ہیں۔ سرتاپا انکسار اور سرتاپا علم، یہی ہماری عظیم روایت تھی اور آج اسی روایت کے وہ ملک بھر میں واحد اور ممتاز نمائندے ہیں۔ ان کی علمی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ محقق بھی ہیں اور مفکّر و نقّاد بھی۔ مترجم بھی ہیں اور لغت نویس بھی۔ قواعد داں بھی اور عالمِ تصوّف بھی اور یہ سب پہلو ان کی علمی اور روحانی شخصیت کے ساتھ ایک جان ہو کر ایک مکمل اکائی بن گئے ہیں۔ اسی لیے دینِ اسلام اور اس کی روایت ان کی ہر تحریر میں رنگ و خوشبو پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہے۔ ایک جگہ نئی نسل سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

> "..... دین کی تکمیل علم، عمل اور اخلاص سے ہوا کرتی ہے..... دنیوی معاملات کے لیے بھی یہی تین چیزیں ضروری ہیں۔ وہ علم بے کار ہے جس پر عمل نہ ہو اور وہ عمل محض فریب ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔ ذرا دیکھیے جو عمل (ادب) ہم پیش کر رہے ہیں اس میں اخلاص کسی درجے میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ اشتراکیت اور جنسیات اپنی جگہ مردود نہیں اور ان کا موضوعِ سخن بنانا کوئی عیب نہیں۔ لیکن بہ قول میرؔ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے.... یاد رکھیے پاکستان صرف ریت کے ٹیلوں کا نام نہیں۔ وہ جس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اس کے حصول کی کوشش کیجیے ورنہ آپ کو نہ صرف قوم کے سامنے بلکہ خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔" (تحقیقی جائزے ص ۱۲۳ - ۱۲۲)

یہی ان کا نقطۂ نظر ہے اور اسی نقطۂ نظر کو انھوں نے اردو ادب کے حوالے سے اپنے ایک مضمون "تہذیبِ جدید کا فکری بحران"

ہیں واضح کیا ہے۔ ان کے اندازِ نظر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی سے پاک ہے اور اعتدال کے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچائی اور حق کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ زبان اور اہلِ زبان کی بحث یوں تو صدیوں سے ہو رہی ہے لیکن گزشتہ چالیس سال سے پاکستان میں کسی نہ کسی عنوان سے جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کسی غیر زبان کے سیکھنے کے لیے ہم لاکھ جتن کریں ہمیں اہلِ زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر انگریزی کا کوئی کتنا ہی بڑا عالم فاضل کیوں نہ بن جائے اس کو اہلِ زبان تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اردو کی نوعیت مختلف ہے۔ انگریزی اجنبی اور پردیسی زبان ہے۔ اردو اسی ملک کی زبان ہے جس کا دوسری ملکی زبانوں کے ساتھ خون کا رشتہ ناتا ہے اور لسانی اشتراک کی وجہ سے وہ برصغیر کے ہر حصے میں خود بخود اور اچھی طرح جانی پہچانی جاتی ہے۔ بول چال کی حد تک اس کی حیثیت بین الملکی زبان کی سی ہے۔ اور سرکاری طور پر اسے قومی زبان کا منصب حاصل ہے اس لیے پاکستان کے ہر شہری کو اردو کے اہلِ زبان بننے کا آئینی حق حاصل ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے جو فطری تقاضے ہیں ان سے روگردانی نہ کی جائے۔ صحت کے ساتھ جو شخص بھی اردو لکھے پڑھے اور بولے وہ اہلِ زبان ہے۔ اس میں پنجاب، سندھ یا کہاں کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح دلّی اور لکھنؤ کا فرق وقت کے ساتھ خود مٹ گیا اس طرح یہ امتیاز بھی ہمیں ختم کرنا ہوگا ..... میرے نزدیک ہر وہ شخص اہلِ زبان ہے جو صحتِ زبان کی قید کے ساتھ اردو لکھنے اور بولنے پر قادر ہو خواہ وہ کہیں کا رہنے والا ہو۔" (تحقیقی جائزے ص ۸۳-۸۵)

یہی وہ رویّہ ہے جس کی ہمیں، ہمارے ملک اور قوم کو زندگی کی ہر سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے مثبت اور تعمیری فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یک جہتی و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ منفی و انتہا پسندانہ رویّوں سے گریز کر کے تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ استادِ محترم ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر اسی نظر سے دیکھا ہے اور یہی وہ طرزِ فکر ہے جس سے علمائے دین صاحبانِ ادب اور اہلِ نظر کو ساری زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ یہ وصل کا راستہ ہے اور باقی سارے راستے فصل کے راستے ہیں۔ مولانا روم نے کہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

لسانی، نسلی و صوبائی تعصبات کے اس دور میں اسی طرزِ فکر کے باعث ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب ایک ایسی مشعلِ پُرنور کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے پاکستانی معاشرے کی ظلمتیں دور ہو سکتی ہیں۔ وہ از سرتا پا محبّت ہی محبّت ہیں۔ وہ محبّت جس سے گلشنِ دل میں بہار آجاتی ہے اور زندگی نفرتوں کی دلدل سے نکل کر انسانیت کے باغ میں آجاتی ہے، جہاں ہر طرف مشامِ جاں کو معطّر کرنے والے پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اسی شگفتگی اور اسی خوشبو سے ڈاکٹر صاحب دینی و دنیوی زندگی کو حیاتِ نو بخش رہے ہیں۔ خدا انھیں ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے۔ آمین۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

"چمنے کہ تا قیامت ....."

لائٹ ہاؤس کی سڑک پر دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان استاد تھا۔ دوسرا بھی درجہ اوّل میں ایم اے کر چکا تھا مگر ان دنوں بے کار اور پریشان تھا۔ مصافحہ اور خیریت دریافت کرنے کے بعد دونوں تانگ واڑے کو چل دیے جہاں ان دنوں کراچی یونیورسٹی کے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے شعبے عارضی طور پر قائم تھے۔ شعبۂ اردو میں کوئی مستقل استاد نہیں تھا۔ مختلف کالجوں کے اساتذہ جز وقتی طور پر تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ راستے میں بے کار نوجوان نے شکوہ کیا رضا علی کالج نیا نیا قائم ہوا ہے۔ اردو کے اساتذہ کا تقرر ہو رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا مجھے وہاں رکھوا دیجیے مگر انھوں نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ دوسرے نے کہا۔ یہ بات ان کے مزاج اور روش کے خلاف ہے۔ وہ تو شاگردوں ہی کے لیے نہیں غیروں کے لیے بھی سراپا لطف و کرم ہیں۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ تمہارا خیال نہیں کیا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں شعبۂ اردو جا پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب سالِ اوّل کے طلبہ کو اقبال پڑھا رہے تھے۔ بالِ جبریل سامنے تھی۔ دونوں نوجوان خاموشی سے کلاس میں جا کر پیچھے بیٹھ گئے اور لیکچر سننے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے پڑھاتے پڑھاتے دفعتاً کتاب بند کر دی۔ بیکار نوجوان کی طرف دیکھا معمول کے دھیمے اور نرم لہجے میں فرمایا۔ "میں آپ کو رضا علی کالج میں رکھوا سکتا تھا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔" یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پھر کتاب کھول لی اور پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ کلاس ختم ہوا تو نوجوان استاد نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔ "یہ آپ نے درمیان میں کیا بات چھیڑ دی تھی۔ یہ کیا قصہ ہے؟" ڈاکٹر صاحب ہنسے اور فرمایا۔ "یہ باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں۔ آپ چائے پئیں، یہ چکر چھوڑیے۔" چند دن کے بعد وہ بیکار نوجوان ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر ایک نہایت عمدہ کالج میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے اور بفضلہ آج تک وہیں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ البتہ رضا علی کالج کچھ دن اپنی بہار دکھا کر ختم ہو گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب تھے۔ پیر و مرشد۔ استادِ مکرم ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں صاحب — اور اس واقعے کا شاہد نوجوان استاد یہ عاجز۔ یعنی یہ سب دید ہے شنید نہیں۔

۱۹۵۰ء میں مجھے شوق ہوا کہ اردو میں بھی ایم اے کیا جائے۔ اس زمانے میں ایم اے کی تدریس کالجوں میں ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں کوئی انتظام نہیں تھا۔ اردو کالج کا شعبۂ اردو اساتذہ کے اعتبار سے بڑا شاندار تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان صاحب صدر شعبہ تھے۔ میں نے ایک ایسے دوست سے جو ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن اور موصوف کے ایک کرم فرما کے صاحبزادے تھے، خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان سے ملا دیں۔ چنانچہ ایک شام ہم دونوں اردو کالج گئے پھاٹک ہی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ لمبا قد

چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادا + صنمے کہ بر جمالت دو جہاں نثار بادا — مولانا روم رح

لیکن بر بنائے انگ ارغم۔ دہرا بدن کہ طلبِ علم در یاضت میں خستگی سے محفوظ رہے۔ گول چہرہ۔ دائرۂ شریعت کی حدود کا ترجمان۔ آنکھوں میں شرم وحیا اور معرفت کی قندیلیں روشن "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" رعونت کی سرکوبی کے لیے ترکی ٹوپی سے مزیّن سر پہ حلق کے آثار، محاسن میں پاکیزگی کا حُسن۔ گندمی رنگ میں طاعت کی جھلک۔ معمولی سوتی شیروانی۔ علی گڑھ کٹ کا پیجامہ۔ پاؤں میں سادہ سی گُرگابی۔ میرے دوست انھیں دیکھ کر ٹھہر گئے۔ ادب سے سلام کیا۔ مجھ سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملو۔ یہاں اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی سانس نیچے کہ تعلق ان دنوں ریڈیو سے تھا جس کے گلیمر کا چرچا کچھ زیادہ ہی تھا۔ تو یہ ہیں ڈاکٹر صاحب۔ خیر چلو یونہی سہی۔ کچھ دن درویشوں کی صحبت ہی میں سہی۔ ممکن ہے تم بھی فیضانِ نظر سے راہِ راست پہ آجاؤ ورنہ ایسے بگڑے کہیں سنبھلتے ہیں۔

کلاس شروع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے لسانیات کا پرچہ شروع کیا۔ نیا مضمون مشکل اور ادق مگر پہلے ہی دن یہ اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب اس جدید علم پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ احمد ہمدانی۔ سیّد کریم الدین۔ اکبر کاظمی ہم درس تھے۔ سب ڈاکٹر صاحب کے تبحّرِ علمی سے مسحور ہوگئے۔ پھر جب ڈاکٹر صاحب نے مومن کا ایک قصیدہ شروع کیا تو اپنی سطحی لیاقت کا بھرم بھی کھل گیا۔ ہم اتنا نہ تھا کہ فارسی پر بڑا عبور ہے اور اردو تو "خانہ زادِ مرے آشیاں کی ہے"۔ مگر وہ نعتیہ قصیدہ ہے

زبانِ لال کہاں اور مدیحِ تاجِ خروس		گرا ہے خاک پہ کیا تاجِ افسرِ کاؤس

ڈاکٹر صاحب نے پڑھایا تو معلوم ہوا کہ لیاقت کسے کہتے ہیں اور علم کس چڑیا کا نام ہے۔ عافیت اسی میں نظر آئی کہ بڑ بڑ کرنے کے بجائے کلاس میں خاموش بیٹھو۔ زیادہ سے زیادہ استفادے کی کوشش کرتے رہو۔ ادھر دور رہنے میں عافیت کے آثار، ادھر ڈاکٹر صاحب کے لطف و کرم کی یہ ارزانی کہ کلاس کے بعد روزانہ چائے نوشی اور علمی گفتگو۔

اس زمانے میں برادرِ مکرم نصر اللہ خاں صاحب کہ ریڈیو میں میرے بزرگ رفیقِ کار تھے اور میں نے ایک دل چسپ شرارت شروع کر رکھی تھی۔ بے شمار لوگ پروگراموں کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہم لوگوں پہ اپنے علم کی دھونس بھی گانٹھتے تھے۔ خاں صاحب نے، اللہ تعالیٰ انھیں سلامت باکرامت رکھے۔ ان مدعیانِ علم کے دفیعے کے لیے یہ طریقہ وضع کیا تھا کہ ہم دونوں ایسے لوگوں کے سامنے کچھ اس قسم کی گفتگو شروع کر دیتے تھے کہ کاشفی نے العلوم فی البروج میں لکھا ہے یا فلکی نے لطائف الطوائف میں اس مسئلے کی تشریح کی ہے۔ کیوں اسلم تمہیں یاد ہے نا وہ کتاب؟ میں بڑی سادگی سے جواب دیتا۔ جی ہاں صندل نیشاپوری نے مفتاح الفتوح میں بھی اس پہ بحث کی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہتا اور علم کی دھونس گانٹھنے والوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔ ہم لوگوں کو فرضی کتابوں کے نام گڑھنے میں خاصی مہارت ہوگئی تھی۔ بڑی روانی سے گفتگو ہوتی اور خوب ہوتی۔ شاہد بھائی، اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے اس قسم کی گفتگو سے بڑا لطف لیتے تھے۔ شامتِ اعمال کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب ریڈیو اسٹیشن پہ تشریف فرما تھے۔ خاں صاحب اور میں نے معمول کی گفتگو شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب سنتے رہے۔ ہماری یاوہ گوئی جاری رہی لیکن بولے کچھ نہیں۔ چلتے وقت فرمایا۔ "اگر یہ کتابیں آپ نے دیکھ لی ہوں تو مجھے بھی استفادے کا موقع دیجیے۔ میں بھی ایک نظر دیکھ لوں"۔ ہم دونوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ۔

"نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن" کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ بڑا افسوس ہوا، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ ہم نے اس قسم کی گفتگو قطعاً ترک کر دی۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اتنی دل پذیر معلوم ہوئی کہ میں نے برادرم وجد چغتائی کو جو اسلامیہ کالج .. ایم اے فائنل کے طالب علم اور ریڈیو میں میرے ساتھی تھے۔ اردو کالج گھسیٹ لیا۔ ہم دونوں ایک دن ہمت کر کے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر بھی پہنچ گئے۔ معلوم ہوا صوفی صاحب کے یہاں گئے ہیں۔ تین چار دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ چغتائی ان دنوں جہانگیر روڈ پر رہتے تھے۔ اکثر اطلاع دیتے۔ ڈاکٹر صاحب سائیکل پر چلے جا رہے تھے۔ آخر کار ایک دن ملاقات ہو گئی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب بالکل بزرگِ خاندان کی حیثیت سے پیش آئے۔ چائے تو خیر معمولی بات ہے۔ شام کو بہت کم ایسا ہوا کہ ہم لوگ بغیر کھانا کھائے واپس آئے ہوں۔ کوئی تکلف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی دسترخوان بچھایا۔ سالن روٹی۔ دال۔ سبزی لائے۔ سب نے بڑے سکون سے سیر ہو کر کھایا۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے لیے قلتِ طعام کے قائل ہیں۔ خود کم کھاتے ہیں اور دوسروں کی تواضع زیادہ کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر چیز ہماری طرف بڑھا رہے ہیں اور اصرار کر رہے ہیں۔ ایک شام میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب تنہا تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے اندر گئے۔ پھر چائے کی دو پیالیاں لیے ہوئے باہر تشریف لائے۔ میں نے دریافت کیا کہ اُستانی اور ماجرہ تو ہیں نہیں۔ چائے کیسے بن گئی؟ ارشاد ہوا۔ میں نے بنائی ہے۔ میں حیرت سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ ایک ادنیٰ شاگرد کے لیے یہ اہتمام۔

ہم لوگ کبھی کبھی شوخی سے بھی کام لیتے تھے کہ یہ ہماری غفلت اور بے شعوری کا دور تھا۔ ایک دن چغتائی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ آپ کو اتنی تنخواہ ملتی ہے۔ آپ اتنے بہت سے روپوں کا کیا کرتے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ چغتائی کہنے لگے۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ ایک مہینے ایک شیروانی میرے لیے۔ اگلے مہینے ایک شیروانی اسلم کے لیے بنوا دیجیے۔ کچھ یہ سلسلہ بھی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب اس پر بھی چپ رہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کیوں کہ یہ محض چغتائی کی شاعرانہ ترنگ تھی۔ پہلی تاریخ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے اور چغتائی کو پچاس پچاس روپے دیے اور فرمایا کہ آپ لوگ شیروانیاں بنوا لیجیے۔ ہم دونوں بڑے شرمندہ ہوئے۔ لاکھ انکار کیا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک نہ سنی اور روپے ہمیں لینا پڑے۔ اس دن کے بعد سے میں اور چغتائی دونوں بڑے محتاط ہو گئے اور بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کرنے لگے۔ ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ کلاس کے بعد ڈاکٹر صاحب جب چائے منگواتے تو چائے والے کے لیے شیروانی کے نیچے کی جیب سے روپیہ نکالتے۔ چہرہ شاہی نہیں نشانِ ملک۔ روپے نیچے کی جیب میں رکھنے کی عادت سے یہ اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بنائے فساد کو دل کے قریب نہیں آنے دیتے۔ ہمیشہ دل سے دور رکھتے ہیں۔

کالج میں ڈاکٹر صاحب شفیق اور ہنس مکھ استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ اپنی جگہ مگر طلبہ اور اساتذہ کے کرکٹ میچ میں لڑکوں نے ڈاکٹر صاحب کے پیروں میں بھی پیڈ باندھے اور ڈاکٹر صاحب نے ہنسی خوشی کریز میں کھڑے ہو کر بلا گھمایا۔ آرنلڈ کی کلچر اینڈ انارکی اس زمانے میں بی اے کے نصاب میں شامل تھی۔ طلبہ اس کے مطالعے سے گھبراتے تھے۔ ایک بار بعض طالب علموں نے اس کتاب کے حوالے سے اپنی پریشانی اور دقتوں کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ساری مصروفیت کے باوجود کتاب کا ایک نہایت عمدہ خلاصہ تیار کر کے طلبہ کو دے دیا۔ سارے ضروری مباحث کا احاطہ تھا۔ سلیس اور آسان

انگریزی کے طلبہ کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ یہ مشکل کام ڈاکٹر صاحب نے محض طلبہ کی سہولت کے لیے انجام دیا۔ وہ نہ انگریزی کے استاد تھے۔ نہ انگریزی کی دقت دور کرنا ان کی ذمہ داری تھی لیکن انھیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ کسی کا بھلا ہو جائے تو انھیں خوشی ہوتی ہے۔ ایک بار سندھ کے کسی کالج کے ایک استاد مجھ سے ملنے آئے۔ کچھ تحقیقی کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دیا۔ چند کتابیں درکار تھیں۔ میں نے خوشی خوشی کتابیں ان کے حوالے کر دیں۔ بہت دن گزر گئے کتابیں واپس نہ پہنچیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب سے ذکر آیا کہ بہت دن ہوئے فلاں صاحب آپ کے حوالے سے کچھ کتابیں لے گئے تھے۔ فرمایا، میں انھیں جانتا نہیں ہوں تاہم اگر میرے حوالے سے کسی کا بھلا ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ پھر کہا، تابمقدور ہر شخص کی مدد کرنا چاہیے۔ آپ جس کی مدد کریں گے ممکن ہے کہ وہ آیندہ کسی اور کی مدد کرے اور سلسلہ جاری رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی امداد تو ہمیشہ شاملِ حال رہتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے غنیمتؔ کے ان چار مصرعوں میں ذرا سا شبہ ہو گیا جو اس نے دربارِ اکبری میں حاضر ہوتے ہی پڑھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں دو تین دفعہ گیا مگر وہ ملے نہیں۔ ناچار پرچہ لکھ کر چھوڑ آیا۔ اگلی دفعہ گیا تب بھی ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے مگر کتاب اور حوالے کا نشان میرے لیے رکھ دیا تھا۔ کالج کے بعض طلبہ ایسے بھی کہ سرتاپا ڈاکٹر صاحب کے رنگ میں رنگ گئے۔ برادرم ڈاکٹر سمیع احمد ہاشمی اور مخدومی منظور احمد فاروقی کے نام مجھے اس سلسلے میں یاد آتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی ذہنی اور روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ عمومی توجہ میں بھی یہ شانِ دل نوازی کہ اِدھر طالب علم نے خدا و رسولؐ کا واسطہ دیا اور اُدھر ڈاکٹر صاحب نے اس کی مراد پوری کی۔ کسی نے کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہوا۔ کیا خدا اور رسولؐ کے واسطے سے بھی بڑھ کر کوئی واسطہ ہے انکسار اور تالیفِ قلوب کی یہ کیفیت کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کالج کی طالب علمی اور اس کے کچھ عرصے بعد تک میں پاکستان چوک کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک دن پڑوس کے ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ اردو کالج کے ایک ڈاڑھی والے استاد بڑی دیر سے سڑک پر ٹہل رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ لاؤ دیکھیں کون ہے۔ نیچے گیا۔ دیکھا تو ڈاکٹر صاحب۔ ارے آپ، آواز کیوں نہیں دی۔ یہاں کب سے ٹہل رہے ہیں۔ بڑی زحمت ہوئی۔ فرمایا۔ ”آواز دینا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ ممکن ہے آپ مصروف ہوں۔ کوئی کام کر رہے ہوں۔ حرج ہوتا۔ یہ سوچا تھا کوئی نیچے آئے گا تو کہلوا دوں گا۔ آپ خود ہی نیچے تشریف لے آئے۔ یہ واقعہ ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ میرے عاجزانہ اصرار کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے آواز دینا گوارا نہ کیا۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے ”فارسی پر اردو کا اثر“ شائع کی۔ مجھے فخر ہے کہ اس کا اشاریہ میں نے مرتب کیا۔ ”کہ میرا نام بھی شامل ہے تیرے نام کے ساتھ“۔ ”حالی کا ذہنی ارتقا“ بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو علمی تحقیق سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ ایک دفعہ میں نول کشور کا شائع کردہ۔ ظہیر فاریابی کا دیوانِ غزلیات پڑھ رہا تھا۔ اس دیوان میں گاؤتکیہ کی ترکیب نظر سے گزری تو بڑا اچنبھا ہوا کہ یہ ہند فارسی ترکیب ظہیر کے یہاں کیسے پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب کو دکھائی۔ آپ نے پوری کتاب پڑھی اور پھر ایک معرکہ آرا تحقیقی مضمون لکھ کر ثابت کر دیا کہ نول کشوری دیوانِ غزلیات ظہیر فاریابی کا نہیں کسی اور شاعر کا ہے۔ بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی اور دینی۔ بے شمار علمی اور تحقیقی مضامین شائع کیے۔ قیامِ پاکستان سے بہت پہلے ڈاکٹر صاحب کے مضامین ”معارف“ اور ”اورینٹل کالج میگزین“ میں شائع ہوتے تھے۔ سید سلیمان ندوی ؒ کی ”نقوشِ سلیمانی“ میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین کے حوالے ہیں۔ ”اقبال اور قرآن“ ڈاکٹر صاحب کی ایک ایسی تصنیف ہے جسے شاید ہی

کوئی اور مرتب کرنے کی ہمت کرتا۔ تصوف اور بالخصوص سلسلہ نقشبندیہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بے انتہا کام کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ، پنجاب اور شمالی علاقوں کی تمام خانقاہوں کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں کے قلمی نسخے دیکھے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب ساری تعطیلات سفر میں گزارتے تھے اور سلسلے کی معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمۃ شہادت کے وقت ایک فرغل پہنے ہوئے تھے۔ وہ دہلی کی کسی خانقاہ میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے ملاحظہ بھی فرمایا اور یہ خیالِ برکت زیبِ تن بھی فرمایا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ میرزا صاحب علیہ الرحمۃ کا قد و قامت اور جسم ڈاکٹر صاحب ہی کی طرح کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب قواعد، عروض، تاریخ گوئی اور فارسی کے کلاسیکی ادب کے بڑے عالم ہیں۔ شعر کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ سید حسن غزنوی کے بارے میں ان کا تحقیقی مقالہ اور انگریزی تالیف "اے ہسٹری آف بہرام شاہ" خاصے کی چیزیں ہیں۔ حال ہی میں میرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمۃ کا فارسی دیوان اور "خریطۂ جواہر" بھی ڈاکٹر صاحب نے از سرِ نو شائع کر دیا ہے۔ بڑی خاموشی سے علمی کام کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی طالب علمی کا پورا دَور علی گڑھ میں گزرا ہے۔ ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ہوسٹل کے بعض لوگوں کا دلچسپ انداز میں تذکرہ بھی کیا ہے۔ مگر جناب حمید جالندھری کے بہ قول جو ڈاکٹر صاحب کے علی گڑھ کے ہم جماعت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب طالب علمی میں بھی بزرگ آثار تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی سے وابستہ رہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ڈاکٹر صاحب ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ وہیں سے ترکِ وطن کر کے کراچی آئے۔ کچھ دن اسلامیہ کالج میں رہے۔ پھر اردو کالج آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کے قیام کے وقت اردو کی پروفیسری کے امیدوار تھے۔ یونیورسٹی نے سرے سے پروفیسر رکھا ہی نہیں۔ اس واقعے کے بعد میں خدمت میں حاضر ہوا تو اس مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ فرمایا افسوس کرنا تقاضائے بشری ہے مگر میں جب اس مسئلے کے بارے میں سوچتا ہوں تو آیۂ کریمہ الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ یاد آتی ہے اور میرا سارا ملال ختم ہو جاتا ہے۔ واقعی اللہ اپنے بندوں کے لیے بہت کافی ہے۔ کچھ ہی دن بعد ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہو کر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے۔ یہ پروفیسری کے امیدوار تھے اللہ تعالےٰ نے انھیں پروفیسری ہی سے نوازا مگر یقین تو ہو ــــ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا ــــ ڈاکٹر صاحب خیر سے حیدرآباد سدھارے مگر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ حالت یہ تھی کہ چھٹے اور پہنچے۔ صبح، دوپہر، شام جب جی چاہا اٹھے اور چلے گئے۔ کالج پہنچ گئے نہیں تو ایک نمبر کی بس پر بیٹھے اور پیر کالونی۔ کیا زمانہ تھا۔ آنا جانا موجبِ فرحت ہوتا تھا۔ اب کہیں جانا ہو تو وحشت بھی ہوتی ہے اور دہشت بھی۔

ڈاکٹر صاحب پیر کالونی میں بھی مرجع خاص و عام تھے۔ حیدرآباد میں بھی لالوں کے لال بنے بیٹھے ہیں۔ صبح سے شام اور شام سے رات تک عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مجھے بے اختیار شیخ شیراز کا شعر یاد آتا ہے ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں + مردم و مرغ و مور گرد آیند

مگر ڈاکٹر صاحب مزاحمتِ خلق سے کبھی آزردہ نہیں ہوتے نہ کسی کی بد اخلاقی پر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دفعہ سندھ یونیورسٹی میں ایک ایسے صاحب وائس چانسلر مقرر ہوئے جو ایک بیٹھ ورانہ کالج کے پرنسپل تو رہ چکے تھے مگر تکریمِ اساتذہ کے احساس سے بے بہرہ تھے۔ چارج لینے کے بعد وہ صدور شعبہ سے ملے۔ اردو کے صدر کو ملائے مکتب سمجھ کر انھوں نے خفیف الحرکاتی

کا معاملہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے اور چپ چاپ اٹھ آئے مگر تمام صدورِ شعبہ نے سخت احتجاج کیا اور وائس چانسلر سے کہا: آپ ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر ان سے معافی چاہیں۔ آپ نے ایک بزرگ کی توہین کی ہے۔ اس کا مداوا معافی اور صرف معافی ہے۔ وائس چانسلر صاحب شام کو ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ دیکھا کہ اس وقت کے صوبائی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑے بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ انھوں نے بھی پاؤں پکڑ لیے "قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں بخش دیجیے خطا"۔ جب تک وہ رہے ڈاکٹر صاحب کا دم بھرتے رہے۔ ان کے نام کا کلمہ پڑھتے رہے۔ علامہ آئی آئی قاضی ہوں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہوں، حسن علی عبدالرحمٰن ہوں، سیّد غلام مصطفیٰ شاہ ہوں۔ سب ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مند تھے۔ اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سندھ یونیورسٹی کیا، ساری علمی دنیا میں ڈاکٹر صاحب عظمت اور بزرگی کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کے احترام کی کیفیت یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے لیے انھیں شعبے میں زحمت نہیں دی جاتی بلکہ ان کے دولت کدے ہی پر امتحان ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بڑا اچھا اجتماع ہوا۔ محمد حسن عسکری مرحوم تھے۔ پروفیسر طاہر فاروقی مرحوم تھے۔ راقم الحروف بھی شریک تھا۔ امتحان کے بعد بڑی عمدہ نشست ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ دن رات عقیدت مند انھیں گھیرے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرا آدمی ہو تو گھبرا جائے مگر اس مزاحمتِ خلق کے باوجود ڈاکٹر صاحب علمی کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ مطالعہ کس وقت کرتے ہیں۔ لکھنے کس وقت ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھ دیے۔ علمی مضامین۔ تحقیقی مضامین۔ حوالوں سے پُر۔ کتابوں پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ خدا معلوم وقت کیسے نکالتے ہیں اور کس طرح یہ کام کرتے ہیں۔ ان کی زبانِ فیض ترجمان سے کم فرصتی کا شکوہ بھی کبھی سننے میں نہیں آیا نہ کسی اضطراب کا کوئی مظاہرہ ہوا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ فلاں کام ہے۔ سخت عدیم الفرصت ہوں۔ اس قسم کی کوئی بات گزشتہ چالیس برس میں مَیں نے نہیں دیکھی۔ صرف ایک دفعہ یہ فرمایا کہ ان دنوں میرے شیخ آئے ہوئے ہیں اس لیے فرصت کم ملتی ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے اکثر چکر آتے ہیں مگر جب دیکھا تو یہی کہ لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ دھیمے اور نرم لہجے سے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر یہ دیکھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں دس بیس آدمی بیٹھے ہیں تو ان میں سے ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ جیسے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور لطف و کرم سب سے زیادہ اسی پر ہے۔ کم نگاہی کا گمان کسی کو نہیں ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ توجہ میری ہی جانب ہے۔

ڈاکٹر صاحب ناراض نہیں ہوتے۔ ناراض ہونا تو دُور کی چیز ہے اونچی آواز سے بھی بات نہیں کرتے۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک چپراسی عبدالغفور نامی تھے۔ بامسمیٰ تو نہیں تھے مگر صاحبِ کمال صوری و معنوی تھے۔ یونیورسٹی کا کوئی محکمہ اور شعبہ انھیں اپنے یہاں رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ سب ان کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے خوشی خوشی انھیں شعبے میں لے لیا۔ عبدالغفور بھی ایسے ڈھیٹ کہ جب موقع ملا ڈاکٹر صاحب کی کتابیں چرا کر بیچ دیں۔ ڈاکٹر صاحب شعبے میں بیٹھے ہیں اور وہ مکان پر پہنچا۔ کہا، ڈاکٹر صاحب نے باہر والی الماری کے پہلے خانے کی سب کتابیں منگوائی ہیں۔ گھر والوں کو کیا معلوم۔ انھیں سے چادر لی۔ پوٹلا بنایا۔ چل دیے۔ کتابوں کے کوڑے کیے اور غائب۔ دو تین

دن بعد مسمی صورت بنائے چلے آ رہے ہیں۔ شعبے میں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ کھانے پینے کا سامان آیا رکھا ہے۔ بھائی نے موقع دیکھ کر خاموشی سے سب صاف کر دیا اور چپکے سے تر اٹ ہو گئے۔ لڑکے ہیں کہ انھیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ بے خبری کے سرور میں آنکھیں موندے کسی کونے کھدرے میں قیلولہ فرما رہے ہیں (یہ ادرم ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی نے ان کا بڑا دل چسپ خاکہ لکھا ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک تاکرد تھے، خدا مغفرت کرے ڈاکٹر صاحب ہی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ مگر ساری زندگی ماہیانِ شبگوں کے شکار رہے۔ ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف باتیں بناتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو سب خبر تھی مگر کبھی کہا کچھ نہیں۔ جب بھی ان کا تذکرہ کیا اچھے ہی الفاظ میں کیا۔ دعائیں ہی دیں۔ خواجہ حسن سجزی کے یہ قول حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ نے ایک دن فرمایا کہ "اندپت کا ایک شخص مجھ کو مجھے ہمیشہ برا کہتا تھا اور میرا برا چاہتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے مرنے کے تیسرے دن میں اس کی قبر پر گیا اور دعا کی کہ یا الٰہی اس نے میرے حق میں جو کچھ برا کہا اور برا چاہا۔ میں نے سب معاف کیا۔ تو اس وجہ سے اسے عقوبت نہ فرما"۔ یہی مسلک ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ کہنے والے کچھ بھی کہیں وہ دعا ہی فرماتے رہیں گے۔ ہاں ڈاکٹر صاحب مذمت بھی کرتے ہیں اور سخت الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مرتدین اور دین کا استخفاف کرنے والوں کے لیے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک بڑے عالم کے صاحبزادے کے علمی تبحر اور عربی دانی کے بڑے معترف تھے۔ بہت اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ وہ باہر چلے گئے۔ شیطان نے انگلی جو دکھائی تو دینِ حق سے منحرف ہو کر تثلیث کے پیرو ہو گئے۔ ان کے اس نبیق تیرہ ہونے میں شاید ننانوے کا پھیر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں ان کی مذمت فرماتے تھے۔ "اشدا علی الکفار" کی کیفیت یہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے بزرگوں کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں۔ والدہ جب تک حیات رہیں انھیں کے ساتھ رہیں۔ بڑی خدمت کرتے تھے ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کے برادر بزرگ مزاجاً کے خشک آدمی تھے مگر ڈاکٹر صاحب ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ میں نے دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہیں کہ بچھے جا رہے ہیں۔ بھائی صاحب ہیں کہ اپنی جگہ چھوٹے بھائی کی عظمت کو سمجھ رہے ہیں مگر خاموش ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اساتذہ کا تذکرہ بھی بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم اور پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم کا ذکر ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے کلاس میں بھی سنا اور کلاس کے باہر بھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے حسبِ ارشاد مولانا احسن کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھوایا تو بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے طالب علم کی مدد ہی نہیں کی رہنمائی بھی فرمائی۔

خندہ جبینی بزرگوں کا شعار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں خندہ جبینی بھی ہے اور حسِ مزاح کا لطیف اظہار بھی۔ میرے ایک دوست کی بہن کے لیے سندھ یونیورسٹی کے ایک استاد کا رشتہ آیا۔ رقعے کے مطابق وہ صاحب پروفیسر بھی تھے اور ڈاکٹر بھی۔ دوست نے مجھ سے معلومات کے لیے کہا۔ یہاں ملا کی دوڑ مسجد۔ ڈاکٹر صاحب کو خط لکھ دیا۔ تیسرے دن جواب آیا۔ "میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صاحب کو پی ایچ ڈی بھی کرا دے۔ پروفیسر بھی بنوا دے اور دوسری شادی انھیں راس آئے"۔ لطیف پیرایہ ہے۔ ہنسی ہنسی میں سب کچھ ہے۔ کوئی شدت۔ طنز یا درشتی نہیں۔ اس قسم کے فقرے

ڈاکٹر صاحب گفتگو میں بھی کھتے ہیں اور خطوں میں بھی تحریر فرماتے ہیں۔ وہ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر کے قائل نہیں۔ خط پڑھا۔ قلم اٹھایا۔ سیدھا سادا مختصر جواب لکھ دیا۔ نہ عبارت آرائی نہ لفاظی نہ علمیت کا کوئی اظہار۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر بھی ان کی شخصیت کی طرح پاکیزہ ہے۔ عام طور پر کارڈ لکھتے ہیں۔ لفافہ کم آتا ہے۔ مگر لفافے والا خط بھی طول طویل نہیں ہوتا۔ سادہ دلنشیں اور مختصر۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ شانِ تحریر ایسی کہ نگاہوں میں کھب جائے۔ دائرے متناسب شوشوں کا صحیح التزام۔ ہر لفظ موتی کی طرح آبدار۔ خط میں چھوٹے چھوٹے فقرے لطیف اور پرکار۔ بس ایک چیز ایسی ہے جس سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خط عموماً چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھتے ہیں۔ انھیں محفوظ رکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ آرزو کا مصرع مجھے یاد آتا ہے "دامن اُس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں" مگر دامنِ یوسف پھر دامنِ یوسف ہے۔

ڈاکٹر صاحب کھلنے ملنے اور تقریبوں میں شرکت کرنے سے اب بر بنائے ضعف بچتے ہیں۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ محفلوں اور تقریبوں میں بے تکلفی سے شریک ہوتے تھے اور پورے وقت تشریف فرما رہتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے دونوں بیٹوں کو بسم اللہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی۔ تسمیہ خوانی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے خاص طور سے حیدرآباد سے تشریف لائے۔ تقریب میں پورے وقت تشریف فرما رہے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے شرکت کی اور رخصت ہو گئے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بیشتر اہلِ علم میں ایک غیر معمولی ادّعا ہوتا ہے۔ انسان جب علم کے کمال پر پہنچتا ہے تو اس کی انانیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں درجۂ کمال حاصل نہیں ہوتا صرف انانیت بڑھتی ہے۔ میں نے یہ لکھا۔ میں نے یوں لکھا۔ ان کا موضوع ہو یا نہ ہو ماہرانہ رائے کا اظہار ضرور کریں گے اور اس زور شور سے کہ اگلا منہ دیکھتا رہ جائے بلکہ بسا اوقات تو منہ پیٹتا رہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس قسم کا کوئی ادّعا نہیں۔ ان کے کسی مضمون یا کتاب کے بارے میں بات کیجیے تو ہنس کر ٹال جائیں گے جیسے آپ نے کوئی غیر ضروری بات چھیڑ دی ہو۔ بحث اور اختلافِ رائے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ اگر کوئی عالم ان سے اختلافِ رائے بھی کرتا ہے تو جواب میں ایسے انکسار اور عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ معترض شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ولی کے ایک شعر

بعدِ شاہِ نجفؑ ولی اللہ
پیرِ کامل علی رضاؒ پایا

کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ اس شعر میں ولی نے ولی اللہ اپنے نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ نام کے اس قسم کے استعمال کی متعدد مثالیں بھی ڈاکٹر صاحب نے اساتذۂ سلف کے کلام سے پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر شادانی مرحوم کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ صحت مند اختلافِ رائے سے فکر کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں مگر شادانی صاحب نے اختلافِ رائے کے اظہار میں ایسے الفاظ استعمال کیے جو کسی بزرگ محقق کے شایانِ شان نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے شادانی صاحب کے اعتراض اور نامناسب الفاظ کا جواب جس انکسار اور عاجزی سے لکھا جو لطیف پیرایہ اختیار کیا اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

"بالکل اتفاقیہ طور پر اردو نامہ (اکتوبر ۱۹۶۷ء) کے بابِ مراسلت کے تحت محترم ڈاکٹر شادانی صاحب کا مراسلہ دیکھا جو انھوں نے راقم الحروف کی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ قاعدہ

یہ ہے کہ جس شخص کی اصلاح کی جائے اسے اس اصلاح کی نقل یا کم از کم اطلاع ضرور دی جائے کیوں کہ ضروری نہیں کہ وہ شخص خود ہی ایسی اصلاح کو ڈھونڈ نکالے اور مستفیض ہو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے اس دیرینہ نیازمند کو کیوں محروم رکھا ...... ڈاکٹر ستّار دانی صاحب کا خیال ہے کہ شاعر کا نام صرف مقطعے میں آتا ہے اور مقطع کے علاوہ نہیں آتا۔ یہ بات چوں کہ آں محترم فرما رہے ہیں لہٰذا صحیح ہو گی لیکن ہمارے پاس شواہد کچھ اور ہی ہیں۔

کیسی مسکینی اور سادگی ہے۔ یہ چیزیں آج کل کے زمانے میں بالکل عنقا ہیں۔ میں نے ادّعا اور انانیت والی بات جو کہی اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس موضوع سے واقف نہیں یا جس موضوع سے انھیں دلچسپی نہیں اس کے بارے میں کبھی گفتگو نہیں کرتے۔ صاف کہہ دیتے ہیں۔ " بھائی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ افسانوی ادب کے بارے میں جب بھی بات چھڑی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " میرا یہ میدان نہیں۔ بہتر ہے آپ کسی اور سے رہنمائی حاصل کر لیجیے "۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہم تو بزعم خویش ہمہ دانی اور ہمہ اوست کے نظریے پر عامل ہیں مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ہمہ از وست کہہ کر دامن بچا لیتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر صاحب جس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی ہمہ از وست والا سلسلہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت دیانت دار اور محنتی استاد اور عالم ہیں۔ ہر تحریر کو پوری ذمہ داری اور ناقدانہ نگاہ سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ میری نگرانی میں لکھے جانے والے بعض تحقیقی مقالوں کے ممتحن ڈاکٹر صاحب تھے۔ آپ نے کبھی سرسری رائے نہیں لکھی تفصیلی رائے اور حد یہ ہے کہ ٹائپ میں ہونے والی املا کی تمام اغلاط کی تفصیل اور ان غلطیوں کی نشان دہی فرمائی جنھیں بہ قول میر صاحب " لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے "

ڈاکٹر صاحب کا لباس ہمیشہ سادہ رہا۔ سادہ شیروانی۔ سفید کرتا یا قمیص۔ لٹھے کا پیجامہ۔ شیروانی کے کپڑے میں کوئی اہتمام نہیں۔ مدتوں ترکی ٹوپی پہنی۔ اب کپڑے کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ دوسروں کو زحمت نہیں دیتے ایک دن دوپہر کو میرے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں غسل خانے میں گیا تو دیکھا ڈاکٹر صاحب نے بنیان دھو کر لٹکا دی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ خدمت کے لیے ہم لوگ موجود ہیں۔ ارشاد ہوا۔ اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ دوسروں کو زحمت دینا اچھا نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب کی سادگی اور انکسار کی کیفیت تو یہ ہے کہ ایک دفعہ میں نے ان کے لیے رکشا روکا۔ آپ نے سفید ڈاڑھی والے معمر رکشا ڈرائیور کو دیکھا تو فرمایا " دین دار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ " اور بڑھ کر اسے سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ سلام میں سبقت فرماتے ہیں۔ یہ ظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے مگر اسی چھوٹی سی بات سے انسان کے کردار اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوگ تو منتظر رہتے ہیں کہ اگلا انھیں سلام کرے۔ کنکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ بہت سے نک چڑھے کالے آدمی کے سلام کا جواب دینا بھی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بہ قول آرم لکھنوی ؎

یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے
ہم لیے رہ گئے سلام اپنا

ادھر کچھ دن سے دین کا چرچا بہت سننے میں آ رہا ہے۔ بڑی خوش آیند بات ہے۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو مگر منہ میں رام بغل میں چھری والی بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں۔ جلسے۔ جلوس۔ محفلوں۔ مذاکروں۔ اخباروں میں دین ہی دین مگر اپنی اور اپنے گھر کی

بات آئی تو رام دہائی۔ ہم میں سے، اور ہم سے میری مُراد ملک کے پڑھے لکھے باشعور طبقے سے ہے۔ کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی نئی نسل کو دنیا کے بجائے دین کی تعلیم کے لیے وقف کیا۔ میرا خیال ہے شاید کسی نے بھی نہیں۔ دنیا دل و دماغ پر ایسی چھائی ہے کہ سب ہرا ہی ہرا نظر آرہا ہے۔ پڑھو سائنس اور قوم کی ڈوگا مگ ڈولتی نیّا کو پار لگاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کا عمل اس کے برعکس ہے۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سراج احمد سلمہٗ معارفِ اسلامیہ کے طالب علم رہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے مکتوبات کی معاشرتی اہمیت پر بڑا نفیس مقالہ لکھ کر سند حاصل کر چکے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ حاجی حرمین الشریفین اور جوانی میں سعادت آثار۔ سراج میاں کے ایک صاحب زادے نے بڑی کم عمری میں قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ کئی بار محراب سنا بھی چکے ہیں۔ یہاں دنیا اور دین کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ بالادستی دین کی اور دنیا حفظِ دین و ایمان کا محض ایک وسیلہ۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا "جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہے دنیا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کا اسی پر عمل ہے۔ ضرورت سے زیادہ نہ رکھو۔ خوش اور مطمئن رہو۔

اب میں اس مضمون کے سب سے مشکل حصّے کی طرف آتا ہوں۔ مشکل یوں کہ انسان جس چیز کو نہ جانتا ہو اس کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے لگے تو مشکل بھی ہوگی اور فضیحت بھی مگر جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ ڈاکٹر صاحب نقشبندی سلسلے کے بڑے بزرگ ہیں۔ مشائخِ عصر میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہزاروں مرید اور عقیدت مند ہیں جو ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں مشیخت اور بزرگی کا تذکرہ ہو تو لوگ فوراً تصرفاتِ روحانی کا بیان لے دوڑتے ہیں۔ ملتان کے ایک بزرگ نے جو حضرت سلطان المشائخؒ کے فیض یافتہ تھے۔ حضرتِ والا سے التماس کی کہ لوگ مجھ سے کرامت طلب کرتے ہیں، میں کیا کروں۔ حضرتِ والا کا ارشاد ہوا "سلوک کے سو درجوں میں سترھواں درجہ کرامت کا ہے۔ اگر تم سترھویں درجے پر قانع ہو گئے تو باقی تراسی درجے کیسے حاصل کرو گے"۔ حضرت سلطان المشائخؒ ہی کا ارشاد ہے کہ "جس طرح انبیاء پر معجزے کا اظہار فرض ہے اسی طرح اولیاء پر کرامت کا اخفا فرض ہے۔ میری دانست میں ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا تصرّف اور کرامت ان کی سادہ اور پاکیزہ زندگی ہے۔ ان کا کمال تربیت ہے جس سے ہزاروں طالبانِ علم اور سالکانِ راہِ معرفت نے اپنی منزل کا تعین کیا ہے۔ وہ فیض جاریہ ہے جس سے اپنے بیگانے چھوٹے بڑے سب یکساں طور پر مستفیض ہوتے ہیں۔ وہ حُسنِ خُلق اور حُسنِ سیرت ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں زندگی کا سلیقہ اور عرفان اُبھرتا ہے۔ ولیے بزرگ۔ محترم مولانا اصلح الحسینی ناقل ہیں کہ ایک محفل میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے پیر و مرشد دونوں تشریف فرما تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب ذرا دور بیٹھے تھے۔ حسینی صاحب کے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ یہ کیسے مرید ہیں کہ پیر سے دور بیٹھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس خطرے کا گزرنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب معاً اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے پیر و مرشد کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ ایک بار میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھا پیر کالونی کے بس اسٹاپ پر لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ جب ہم ان لائنوں کے قریب سے گزرے تو ڈاکٹر صاحب نے ایک صاحب سے کہا۔ آپ اس لائن میں کیسے کھڑے ہو گئے۔ یہ بندر روڈ والی لائن نہیں۔ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ میں نے لاکھ پوچھا مگر ڈاکٹر صاحب نے کوئی تشریح نہیں کی۔ اصل میں یہ باتیں تشریح کی ہیں بھی نہیں۔

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی کسے سِرّش نمی داند زباں در کش زباں در کش

ڈاکٹر صاحب سیّد زوّار حسین شاہ علیہ الرحمۃ سے بیعت ہیں۔ مجھے شاہ صاحبؒ کی خدمت میں متعدد بار حاضری کی سعادت

حاصل ہوئی ہے. نورانی چہرہ۔ پاکیزہ شخصیت۔ نہایت حاضر علم کے باوجود اظہارِ خیال میں محتاط۔ ایک بار میرے سامنے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ شاہ صاحبؒ نے احیاؑ العلوم کھولی اور ان سے فرمایا۔ سنو، امام غزالیؒ کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کی روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا بڑا احترام فرماتے تھے اور بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک بار شاہ صاحبؒ حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ میں بھی قدم بوسی کے لیے گیا۔ عصر سے بعد عشا تک نشست رہی۔ مرشد کے حسبِ ارشاد نماز ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ نماز میں ڈاکٹر صاحب کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ نقش بندیہ سلسلہ علمی و فود کا سلسلہ ہے کہ بزرگانِ سلسلہ سے بڑا گہرا ان قدر تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس سلسلۃ الذہب کے رکنِ رکین ہیں. ایں سلسلہ از طلائے ناب است۔

ڈاکٹر صاحب کے انوار۔ احوال اور آثار کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے بس اتنا ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو فرحتِ روحانی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں۔ بہتر اور پاکیزہ دنیا کا تصور ابھرتا ہے۔ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ انسانیت کے بہتر مستقبل پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے"

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اُردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ۔
اس کتاب پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔
یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اُردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں — ایہام کی تحریک — اصلاحِ زبان کی تحریک
علیگڑھ تحریک — فورٹ ولیم کالج — انجمن پنجاب کی تحریک
رومانوی تحریک — ترقی پسند تحریک — حلقۂ اربابِ ذوق
اقبال کی تحریک — اسلامی ادب کی تحریک — ادبی ثقافتی تحریک

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

ڈاکٹر نجم الاسلام

آں کہ من دانم و داند دلِ من

۱۔ خدماتِ زبان و ادب کے اعتبار ہی سے نہیں، سیرت و کردار کے لحاظ سے بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی شخصیت عظمت کے بہت سے پہلو رکھتی ہے۔ یہ میرے لیے ایک بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انجمن کی اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک مختصر مضمون پیش کر رہا ہوں۔

۲۔ اس مضمون کا سرنامہ حالی کے ایک شعر کو بناتا ہوں جو ڈاکٹر صاحب پر بالکل صادق آتا ہے:

سلف کی دیکھ رکھو راستی و راست اخلاقی کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

۳۔ اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ اور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور خدمات کے بارے میں چند تاثرات اور مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ پہلی اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک کثیر الجہات شخصیت ہیں۔ تاہم توازن حیرت انگیز طور پر قائم رکھا ہے۔ عالم، معلّم، مصنّف، محقق، نقّاد، مصلح، سالک، عابد، صلاح کار اور کیا کچھ نہیں۔ کثرت سے سفر کرنے والے۔ اب تو نہیں مگر کچھ عرصہ پہلے تک بہت سفر کیے ہیں۔ ضرورۃً شعر بھی کہہ لیتے ہیں، قطعاتِ تاریخ کی حد تک، اور کھرا شعر کہتے ہیں۔ طب سے بھی لگاؤ ہے، خدمتِ خلق کے لیے مشورہ بھی دے دیتے ہیں، دستیاب ہو تو دوا بھی۔ مخلوقِ خدا طرح طرح کے مقاصد لے کر کثرت سے رجوع کرتی ہے۔ مگر علمی مشاغل پوری باقاعدگی سے جاری رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے وقت میں بڑی برکت ہے۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب کثیر اللسان بھی ہیں۔ اردو، فارسی پر تو وہ سند ہیں۔ عربی بھی خوب آتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات ازبر ہیں۔ انگریزی خوب لکھتے ہیں۔ بول بھی لیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈگری کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے بھی تھے۔ ہندی اور سندھی سے بھی بہ قدرِ ضرورت واقف ہیں۔ چھے زبانیں آتی ہیں۔ اور اپنے علمی تصنیفی کاموں میں اس واقفیت سے پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

۵۔ کثیر التصانیف بھی ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہو گئی ہے۔ جو لکھا، بفضلہٖ چھپ بھی گیا۔ بیشتر کتابوں کی صورت میں، کچھ رسائل میں۔ مطبوعہ مقالات کی ایک تعداد اب بھی کتابی صورت میں لائی جانی ہے۔ ان میں ۱۴ وہ مقالات بھی ہیں جو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں کنٹری بیوٹ کیے گئے ہیں۔ اکثر کتابیں خود ہی

چھپوا دیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو ناشرین نے چھاپی ہیں، از خود چھاپی ہیں۔ کسی ناشر سے کہا نہیں کہ ہماری کتاب چھاپو چھپ گئی تو اس پر تبصرے لکھوانے کے جتن نہیں کیے۔ یہ اللہ کا ایک بڑا کرم رہا کہ اس معاملے میں کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہیں۔ مطبوعات کا یہ سلسلہ اب بھی، عمر عزیز کے ۶۷ ویں برس میں بھی اسی صبر و سکون سے جاری ہے۔ چنانچہ اسی سال ۱۹۸۸ء کی جنوری میں "دیوانِ میرزا مظہر جانِ جاناں مع خسر لیطۂ جواہر" اپنے مقدمے کے ساتھ چھپوایا ہے۔ ایک کتاب "ہمہ قرآن در شانِ محمد" اور مقالات کا ایک مجموعہ زیرِ کتابت ہے۔

۶۔ دل سے قدر کرنے والوں اور اچھا کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو ڈاکٹر صاحب کے حق میں دست بہ دعا ہے۔ معاصر فضلا، تلامذہ، مریدین، متوسلین، عقیدت مند جو ایک بار ملتا ہے وہ بھی، جو تیس چالیس پچاس برس کا شناسا ہے وہ بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انعاموں میں سے ایک انعام ہے جو ایک اچھے طریقے پر استقامت کے ساتھ ساری زندگی گزارنے والوں کو ملتا ہے، یونہی حاصل نہیں ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے برِّصغیر کے تین کالجوں اور تین یونیورسٹیوں میں مجموعی طور پر ۳۵، ۴۰ برس پڑھایا ہے، خوبی اور نیک نامی کے ساتھ پڑھایا ہے۔ تلامذہ کی ایک کثیر تعداد ہے۔ کم و بیش اتنے ہی عرصے سے لوگوں کو خیر و ایمان کی صلاح بھی دے رہے ہیں۔ عقیدت مند بھی کچھ کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی دور دراز علاقے میں بھی چلے جائیں تو کوئی نہ کوئی شاگرد یا عقیدت مند نکل ہی آتا ہے، اور کس عقیدت، محبت اور اخلاص سے ملتا ہے۔ یہ صورتِ حال آج کے اساتذہ سے کس قدر مختلف ہے جو حفظِ حرمت کی دعا مانگتے ہیں۔

۷۔ شخصی خوبیاں تو ڈاکٹر صاحب میں بہت سی ہیں۔ جو خوبی سب سے نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک متحمل مزاج انسان ہیں۔ شاگرد، رفقا، احباب، عقیدت مند، اعزّا، متوسلین، بڑے، چھوٹے، غرض کہ جو جہاں ہے میں نے سب کے ساتھ تحمل کا برتاؤ ہی کرتے پایا ہے، حالاں کہ واسطہ تو کیسے کیسے تحمل شکن افراد کے ساتھ رہا ہے۔

۸۔ اسی تحمل کے سبب ڈاکٹر صاحب کو روک ٹوک اور نصیحت فضیحت کرتے بھی کم ہی دیکھا ہے۔ ہم اساتذہ اکثر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ عمر آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو۔ نتیجہ الٹا نکلتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کس قدر الگ ہے۔ وہ یہی کام اپنے مثبت عمل سے لیتے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل، کردار، اندازِ حیات اپنے اندر ایک خاموش تبلیغی صفت رکھتا ہے، جس کا مثبت اثر ظاہر ہوتے بارہا دیکھا ہے۔

۹۔ علمی کاموں میں دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ان سے تعاون کے معاملے میں ہمارے بعض فضلا ویسی وسیع قلبی کا مظاہرہ کم ہی کر پاتے ہیں جیسی کہ توقع رکھی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب کو نہایت وسیع القلب اور دوسروں کا لحاظ رکھنے والا (CONSIDERATE) پایا ہے۔

۱۰۔ تلامذہ کی علمی تربیت میں بھی ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ مثبت طور پر حوصلہ افزائی اور تعاون کا طریقہ جس کی بدولت مقدار و معیار دونوں لحاظ سے اتنا بہت سا تحقیقی کام ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے اور اتنے بڑے پیمانے پر تلامذہ نے فیض پایا ہے کہ معاصر فضلا میں مشکل ہی سے اس کی نظیر ملے گی۔

۱۱۔ علمی اور تحقیقی کاموں کو وسعت اور گہرائی کے ساتھ انجام دینے کے لیے ایک خاص انداز پر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

دنیا کی بہت سی دل چسپیوں اور ضرورتوں پر علمی اور تحقیقی ضرورتوں کو فوقیت دیے بغیر اس میدان میں کامیابی کا امکان ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک خاص طرح کا لائف اسٹائل ہے جسے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بہترین علما اور محققین نے اسی طور پر اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا لائف اسٹائل بھی ان کے علمی و تحقیقی کاموں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اپنے اندر ایک مثال رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمی زندگی کے شروع ہی میں تحقیقی سرگرمیوں کو اپنا مرکز و محور بنا لیا تھا، اور اس کے لیے ضروری طور پر خود کو تیار کیا۔ فضلائے وقت سے استفادہ، برصغیر کی اکثر بڑی لائبریریوں تک رسائی، علمی استفادہ، علمی اور تحقیقی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مستعدی اور انہماک، حوالے کی کتابوں کا ایک ذاتی ذخیرہ تاریخ و ادب کے ضروری مصادر تک رسائی، اپنے موضوع پر عبور —— تحقیق کے یہ سب بنیادی لوازم ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں یکجا کر لیے تھے۔

۱۲۔ کتابوں کا ایک اچھا اور تحقیقی کاموں میں خاصا مفید و مددگار ذخیرہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے جس تک اکثر تلامذہ اور معتقد کی رسائی رہی ہے۔ اس میں کتابیں ضائع بھی ہوئیں لیکن وسیع القلبی کے ساتھ یہ فیضان اب بھی جاری ہے۔

۱۳۔ چند خوبیاں اور بھی ہیں جو بہت نمایاں ہیں۔ یکسوئی غضب کی ہے۔ باوجودیکہ مصروفیات متنوع اور کثیر ہیں۔ علمی کاموں میں یکسوئی برقرار رہتی ہے۔ حافظہ نہایت قوی ہے۔ گو کہ اب کبھی کبھی نسیاں کا عذر کرتے ہیں، لیکن علمی مسائل میں تو قوتِ حافظہ الحمد للہ ویسی ہی قوی ہے جیسی کہ تھی۔ کاموں کو جلد نمٹانے کی عادت بھی ایسی ہے کہ شاید و باید۔ معاملہ دفتری ہو تو فی الفور جواب دے دیا۔ تحقیقی کام ہوا تو اپنے وقت پر، بلکہ جلد تر، پایۂ تکمیل کو پہنچا لیا۔ "اقبال اور قرآن" کم و بیش ہزار صفحے کی کتاب تھی، چند ماہ میں مکمل کر لی۔ اتنی بہت سی کتابوں پر نظر ثانی کی، مقالات کی درستی کی۔ جلد اور پہلی فرصت میں کی۔ مراسلات کا جواب ہوا تو فوراً گیا، کسی سے کتاب مستعار لی تو استعمال کے بعد واپسی میں عجلت کی۔ غرض کہ انگریزی محاورے میں یوں کہیے کہ ڈسپوزل بہت کوئیک ہے۔

۱۴۔ ان بہت سی خوبیوں نے مل کر ڈاکٹر صاحب کو عام زندگی میں ایک بہت پسندیدہ اور قابلِ تقلید شخصیت کی حیثیت سے، اور علمی دنیا میں ایک کثیر التصانیف عالم و محقق کی حیثیت سے ایک ایسے بلند و بالا مقام پر پہنچایا ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک روشن مینارۂ نور ہیں۔ ان کے علمی تحقیقی اصول اور طریقے وہی پسندیدہ اصول اور طریقے ہیں جو علمائے سلف کے تھے اور ان کے اپنے دور میں شبلی، شیرانی، سلیمان ندوی، شیروانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے اصول اور طریقے رہے ہیں۔ اپنی تحقیقات میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ اردو فارسی، انگریزی ماخذوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، اور مقصد ڈاکٹر صاحب کی کتابوں پر اظہارِ خیال بھی نہیں لیکن یہاں ڈاکٹر صاحب کے ایک علمی و تحقیقی رویے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو ان کے تلامذہ کے لیے ایک نمونہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ایسے تحقیقی مقالوں میں جو کسی کے رد میں لکھے گئے ہوں اس فاضل کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے۔ چناں چہ اپنے معرکہ آرا تحقیقی مقالے "مجدد الف ثانی پر حرف گیری کا جائزہ" میں یہی طریقہ اپنایا ہے۔ وہ اپنے تلامذہ کو بھی اسی پر کاربند دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ مقصد تو غلط فہمی کا ازالہ یا غلط بیانی کی تردید ہے نہ کہ کسی خاص شخصیت کو نشانہ بنانا۔

۱۵۔ فنِ املا کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے طریقے پر کاربند ہیں۔ اسی طریقے کی پیروی ڈاکٹر صاحب کے اثر سے ان کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد استقامت کے ساتھ کر رہی ہے۔

۱۶۔ چند اوّلیات بھی ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے حصّے میں آئی ہیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر اگر وہ خود بھی زبان پر لائیں تو روا ہے۔ اور میرے لیے تو ضروری ہے اس موقع پر بیان کروں۔ برّصغیر کی تین جامعات کے اردو نصابوں کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے بھرپور حصّہ لیا ہے۔ اور ان میں خصوصیت کے ساتھ اقبالیات اور اسلامیات کو قرار واقعی حصّہ دلایا ہے۔ فنِ املا کی تاریخ اور اصلاحِ زبان و املا کو نصاب کا حصّہ بنانے میں بھی انھوں نے پہل کی ہے۔ ایم اے کی سطح پر اب تو برّصغیر کی بہت سی یونیورسٹیوں میں تحقیق کے اصول اور طریقِ کار کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ مگر اس ضرورت کو ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے محسوس کیا۔ چناں چہ اس موضوع پر اپنے مقالے "فنِ تحقیق" کی صورت میں اردو میں قابلِ مطالعہ مواد پیش کرنے میں اور ایم اے اردو کے نصاب میں فنِ تحقیق کے اصول اور طریقِ کار کا پرچہ داخل کرنے میں ان کو اوّلیت حاصل ہے۔ اسی طرح اردو کے نصاب میں ابتدائی عربی اور ابتدائی فارسی کا پرچہ شامل کرانے میں بھی وہ اوّلیت رکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا نعتیہ شاعری کو اردو نصاب میں نمایاں طور پر داخل کرنے میں اور نعتیہ مشاعروں کو شعبہ جاتی غیر نصابی سرگرمیوں کا حصّہ بنانے میں بھی پہل ڈاکٹر صاحب ہی نے کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی اور اسکالر صاحبان کی رہنمائی بھی سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہے۔ اس باب میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ مغرب میں گیپ قریب آتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نگرانی کے کام میں ابھی مصروف ہیں اور بہت آگے نکل جائیں گے۔ "اردو اور قرآن" کے حوالے سے پی ایچ ڈی کے معیار کا سب سے زیادہ اور باہم دیگر مربوط کام بھی ڈاکٹر صاحب ہی کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچا ہے اور یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ذریعے انجام پائی ہے۔

۱۷۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں:

(۱)

عنوانِ خراج ذکرِ منظوم — استاذی و مشفقی و مخدوم
نام ان کا غلام مصطفےٰ خاں — کام ان کا صلاحِ خیر و ایماں
اخلاق ہے بے مثال اُن کا — ہے سب پہ عیاں کمال اُن کا
اوصافِ سلف کا آئینہ ہیں — مینارۂ نورِ اتقا ہیں
ناری، عالم، ادیب، نقّاد — اِس دور کے اک عظیم استاد
تحقیق ہے خاص کام اُن کا — اِس فن میں بڑا ہے نام اُن کا

(۲)

حالی کا جو ذہنی ارتقا ہے — کیا اچھے طریقے پر لکھا ہے
بہرام و حسن پہ وہ کیا کام — سب معترف اُس کے خاص اور عام
ثابت کیا اک کتاب لکھ کر — اُردو کے اثر کو فارسی پر
نایاب مجدّدی رسائل — چھپوائے باہتمامِ کامل
اقبال کی شاعری کا رشتہ — قرآنِ مجید سے ملایا
انمول کتابیں اُن کے گھر ہیں — شاگرد بھی جن کے بہرہ ور ہیں

برسوں سے یونہی بہ فضلِ باری
ہیں ان کے فیوضِ علم جاری

ڈاکٹر نظر کامرانی

استادِ محترم

درمیانہ قامت، سانولی رنگت، بیضوی آنکھیں، دُہرا بدن، شرعی ڈاڑھی جس میں صبح وشام کا حسین امتزاج، زبان شُستہ، لہجہ رفتہ، لباس مخصوص، ترکی ٹوپی اور اب سادہ کپڑے کی ٹوپی استعمال کرنے لگے ہیں۔ شیروانی جس کے بٹن سردی ہو یا گرمی، ہر موسم میں بند — چوڑے پائنچوں کا پاجامہ۔ ٹخنوں سے اونچا — ہلکا جوتا — لہجے میں چھوٹوں کے لیے ملائمت — بڑوں کے لیے تمکنت — چال ایسی جیسے مخمل پر چل رہے ہوں — نہ سختی سے قدم اٹھے نہ تیزی سے بڑھے — یہ تمام خصوصیات اگر آپ کو اس نفسانفسی کے دور میں نظر آجائیں تو آپ یقین کرلیں — کہ یہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ہیں۔

آپ اجنبی ہوں یا برسوں کے شناسا — جب بھی گفتگو کریں گے — آواز میں نرمی ہوگی اور لہجے میں شیرینی — اندازِ گفتگو میں اپنائیت بھی سنائی دے گی اور یگانگت بھی — معلوم ہی نہیں ہوگا کہ آپ جس شخص سے مخاطب ہیں — یہ شخص علی گڑھ کا تعلیم یافتہ ہے۔ پی ایچ ڈی بھی ہے اور ڈی لٹ کی ڈگری بھی رکھتا ہے۔ خطابت سے پتہ نہ چلے گا کہ یہ شخص اتنا تعلیم یافتہ ہے بلکہ ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی ہم میں سے ہے جو ہماری باتیں نہایت سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ ہم سے بیان کر رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس تاریکی میں جہاں غیروں کو تو کیا اپنوں کو پہچاننا مشکل ہو رہا ہے — مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں — آپ باتوں ہی باتوں میں کام کی باتیں کر جاتے ہیں — اندازِ بیان اتنا پیارا جیسے صبح کی ہوا چل رہی ہو — آواز اور لہجہ ایسا دل کش جیسے جھرنے سے پانی بہہ رہا ہو۔

یہ بات کوئی ۲۰-۲۲ سال پہلے کی ہے۔ جب میں نے گریجویشن کیا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں گھر میں ہی بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے تھے — بھائی صاحب بنکار بنانا چاہتے تھے، احباب کا خیال تھا کہ امریکہ جاؤں — ذاتی رائے تھی کہ ادب وصحافت کی پُرخار راہوں میں قدم رکھوں — آخر کار بات یہاں تک پہنچی کہ میں نے شعبۂ اردو میں داخلہ لے لیا۔ جب والدہ صاحبہ کو علم ہوا تو انھوں نے دعا دی کہ تمہاری دنیا کے ساتھ آخرت بھی سنورے — اہلِ دل نے کہا — اب تو دنیا بھی سنوری اور دین بھی محفوظ ہوا — اور واقعی والدہ صاحبہ کی دعا قبول ہوئی — ہم نے دین بھی پایا اور دنیا بھی — اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کے ساتھ تربیت کا اثر ہے۔

ڈاکٹر صاحب راست گفتار، نیک دل انسان ہیں۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے وہی ان کی زبان پر آتی ہے —

اپنے انداز میں سوچتے ہیں اور اپنے ہی انداز میں جواب دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر رخ۔ حضورؐ کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ آپ کا ہر قدم اس راستے کی جانب اٹھتا ہے جس کی نشاندہی حضورؐ نے فرمائی۔

ادب کی دنیا میں آپ کا نام بھی ہے اور کام بھی۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور مذہبِ اسلام کے جیّد عالم ہیں، محقق ہیں، مترجم ہیں۔ ان کی لاتعداد کتابیں ہیں۔ جن میں علم و ادب بھی ہے۔ قرآن کا تذکرہ بھی ہے اور مطالبِ قرآن بھی۔ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا بیان بھی ہے اور مجدّد الف ثانی کے کارناموں کا ذکر بھی۔ غرض یہ کہ آپ نے تمام موضوعات کا حق ادا کیا ہے۔

آپ ہر مسئلے کا حل قرآن و سنّت کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے ہیں۔

برّصغیر کے علاوہ آپ کی شہرت دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ جامعہ ازہر کے منتظمین نے ڈاکٹر صاحب سے کتابوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں کہ نصاب میں کون سی کتب شامل کی جائیں۔ صاحبِ موصوف نے نہایت مختصر جواب ارسال کیا۔

"آپ کورس میں جو کتابیں چاہیں شامل کر لیں لیکن اساتذہ کا انتخاب اتنا اچھا کیجیے کہ وہ تعلیم سے زیادہ تربیّت کا خیال رکھیں۔ تربیّت اچھی ہو تو کتابیں خود شاگرد تلاش کر لیتی ہیں۔"

سندھ یونیورسٹی کے قیام کے موقع پر ڈاکٹر علاّمہ آئی آئی قاضی صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں اساتذہ کی اتنی اچھی ٹیم کو یکجا کر لیا تھا جس پر سندھ یونیورسٹی آج تک فخر کرتی ہے۔ اس واقعہ کے راوی خود قاضی صاحب تھے۔

آپ نے فرمایا۔

"جب جامعۂ سندھ میں شعبۂ اردو کے لیے صدرِ شعبہ کی تلاش ہوئی تو ہماری نگاہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب پر ٹھہری۔ آپ کو ہندوستان سے ہجرت کیے ہوئے چند سال ہوئے تھے اور ابھی آپ پوری طرح سیٹ بھی نہ ہو پائے تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ روزانہ سائیکل پر پیر الٰہی بخش کالونی سے اردو کالج تک جاتے تھے۔ اور جب ایک روز اردو کالج کے چپراسی نے ڈاکٹر صاحب سے سائیکل کی ضرورت کا تذکرہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی اکلوتی سائیکل کالج کے چپراسی کے حوالے کر دی کہ، اس کی ضرورت مجھ سے زیادہ تم کو ہے۔ کیوں کہ تم میرے مقابلے میں بہت دور سے آتے ہو۔ اور خود بس پر آنے لگے۔ ان ہی دنوں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ کہ آپ سندھ یونیورسٹی آجائیں۔ یونیورسٹی نئی نئی بنی ہے۔ جو بنیادیں اس وقت رکھ دی جائیں گی وہ مستقبل کے لیے کارآمد اور سودمند ہوں گی۔ اگر بنیادیں گہری اور مضبوط ہوں گی تو عمارت سیدھی کھڑی ہوگی۔ ہم نے وہ تمام سبز باغ بھی دکھائے جو تقاضائے وقت میں شامل تھے۔ رہائش کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یونیورسٹی گھر سے نہایت قریب۔ تنخواہ حد درجہ معقول۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ فرمایا۔ اس وقت میری ضرورت وہاں سے زیادہ یہاں ہے۔ میں حیدرآباد واپس لوٹ گیا۔ لیکن مجھے خواب میں ہدایت ملی۔ غلام مصطفیٰ کو یہاں لے آؤ۔ اور میں نے جواب دیا۔ وہ تو انکار کر چکے ہیں۔ حکم ہوا۔ اب جاؤ، کامیاب لوٹو گے۔ میں صبح اٹھا اور پھر کراچی روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ رات کے خواب کا حوالہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ میں تیار ہوں۔ مجھے بھی ہدایت مل چکی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کراچی سے سندھ یونیورسٹی پہنچ گئے"

اور سندھ یونیورسٹی میں جب تک اساتذہ کے انتخاب میں دیانت داری برتی گئی کوئی مسئلہ وہاں سر نہ اٹھا سکا۔ ڈاکٹر صاحب کے شعبہ میں کبھی بھی سوسائٹی کے انتخاب نہیں ہوئے۔ ہمیشہ نامزدگیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود اس خوش اسلوبی سے نامزدگی فرماتے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا اور سال بھر تمام تقریبات بہ حسن و خوبی انجام پاتیں۔ اور آج۔ یہ عالم ہے، کتابوں اور قلم کی بجائے طلبہ کے ہاتھ میں کلاشن کوف اور کارتوس کے میگزین ہیں۔

آج میں جس منصب پر فائز ہوں اس کے فرائض میں اساتذہ کا انتخاب بھی شامل ہے اور میں یہ بات نہایت فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کی روشنی میں مجھے اساتذہ کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے حکم کے مطابق اساتذہ کا انتخاب کرتا ہوں۔ اپنے پاس بلوا کر نہیں بلکہ ان کے دولت کدے پر جا کر۔ ان سے درخواست لے کر۔ خود درخواست پیش کر کے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں اساتذہ نے اس بد نظمی اور انتشار کے دور میں ایک ذمہ داری نبھانے کی نئی مثال قائم کی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کے اس حکم کو عملی جامہ پہنائیں تو حال بھی منوّر اور مستقبل بھی محفوظ۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے عمر کا ایک حصّہ ڈاکٹر صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر گزارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُن ہستیوں میں سے ہیں جن کے شاگرد احترام کی وجہ سے ان سے ہم کلام ہونے میں احتیاط برتتے ہیں۔ میرا تو ذکر ہی کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب ناگپور یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے تو اس کے ایک ماہ بعد میں نے اس جہانِ رنگ و بو میں قدم رکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر و تحریر میں ہم نے جو اعتدال اور سادگی پائی ہے، وہ اعتدال اور سادگی بہت کم لوگوں میں دیکھی۔ سادگی اور اعتدال سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی عبارت ہے۔ اسلام، اسوۂ حسنہ، شریعت اور طریقت اور حُبِّ اسلام پر جب بھی گفتگو ہوگی تو آپ کے سامنے جو نقوش اُبھریں گے وہ ڈاکٹر صاحب کے ہوں گے۔

ہم نے خطابت میں دریا بہانے والوں کو بھی دیکھا ہے اور وہ منظر بھی دیکھا ہے، کہ خطابت کا دریا خطیب کو لے ڈوبا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب تقریر کے معاملے میں دریا بہانے کے قائل نہیں۔ آپ کی تقریر میں ہر وقت ٹھنڈے پانی کے چشمے اُبلتے رہتے ہیں جو سامع کی پیاس بھی بجھاتے ہیں اور زندہ رہنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں اور تنا وری سے آگاہی بھی بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے روزانہ سیکڑوں افراد ملاقات کرتے ہیں اور اُن ملاقاتیوں میں آپ یہ اندازہ لگانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کہ کون ڈاکٹر صاحب سے کتنا قریب ہے۔ ان کے ہاں وزیر بھی آتے ہیں اور فقیر بھی۔ عالم بھی ملتے ہیں اور جاہل بھی۔ استاد بھی ملتے ہیں اور شاگرد بھی۔ یہ تمام آپ کو ایک ہی صف میں نظر آئیں گے۔ آپ کو محمود یہاں ملے گا اور ایاز بھی مگر وہ سب ایک ہی صف میں بیٹھے نظر آئیں گے۔ آپ کے پاس سب کے لیے ایک جیسا خلوص، ایک جیسی محبّت، ایک ہی نگاہِ کرم، ایک ہی اندازِ گفتگو نظر آئے گا۔ اور یہی وجوہات ہیں کہ آپ کے ہاں صبح سے شام تک ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

آپ کی زندگی تکلّف سے دور اور اتنی سادہ ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک روز کے قیام کے لیے یہاں ہیں۔ کل سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ ایک چارپائی جو گدّے سے بے نیاز جس پر ایک ہلکی سی چادر، ایک ہلکا سا تکیہ، برابر میں ایک تپائی۔ کتابیں بہت ہیں لیکن شوکیس میں نہیں۔ بلکہ یہ بھی نہیں معلوم وہ مکان کے کس کونے میں ہیں۔ لیکن جو رسالہ یا کتاب آپ طلب کریں گے، بغیر تاخیر کے خود پیش کریں گے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

سادگی اور عاجزی کا یہ عالم ہے کہ سلام میں ہمیشہ پہل کریں گے۔ مسکراہٹ ہر وقت چہرے پہ پہرہ دیتی ہوئی ملے گی۔ آنکھیں ملیں اور مسکراہٹ نے آپ کے دل و دماغ پہ گلاب پاشی کی۔ اور پھر آپ اس مسکراہٹ کے حصار میں گرفتار ہوئے۔ اور اس شخصیت کے پرستار ہو گئے۔

آپ بولتے کم ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں، موتی رولتے ہیں۔ قلم میں لطافت، زبان میں شرافت اور ذہن میں ذہانت۔ کسی کے خلاف قلم اٹھاتے نہیں۔ اور دل شکنی دشمن کی بھی پسند نہیں۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کوئی کتنی ہی بے شرمی اور بے حیائی سے آپ کو دھوکا دے۔ بڑی شرافت اور خلوص سے دھوکا کھاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دھوکہ دینے والے کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے کہ انھیں کیا معلوم ہے اور کیا نہیں۔

کئی حج کر چکے ہیں اور حج پہ جاتے ہیں تو صرف ایک سفید بیگ جو کندھے پہ پڑا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سیکڑوں کی فرمائشیں پوری کرتے ہیں اور لاکھوں کی سفارش۔ کام ہو جائے تو خوش ہوتے ہیں۔ کام نہ ہونے پہ بے قرار رہتے ہیں۔

زندگی کے تجربات بلا تکلّف بیان کرتے ہیں۔ اور تجربات کی روشنی میں دین و دنیا سنوارنے کے طریقے سمجھاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ نصیحت کرتے ہیں کہ جو مقرر اپنی گھنٹوں کی تقریر میں نہیں کر پاتے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ گفتار کے نہیں کردار کے غازی ہیں۔ انھیں نہ اقتدار کی ہوس ہے نہ صاحبانِ اقتدار سے قریب ہونے کا شوق۔ نہ انھیں نام و نمود سے واسطہ ہے اور نہ شہرت کی طلب۔ وہ اپنے جہانِ علم و دانش میں مست و مگن ہیں۔

ڈاکٹر صاحب میں جو استغنا ہے، جو بے نیازی ہے، جو نرمی و ملائمت ہے۔ جو اعتدال و توازن ہے۔ وہ صرف ان کا اور صرف ان ہی کا حصّہ ہے۔ یہ بیش بہا دولت ان کی ہے جو انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے شاگردوں میں لٹائی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو انعامات و اعزازات کی کبھی خواہش نہیں رہی۔ نہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے پیچھے بھاگ کر اپنے آپ کو ہلکان کیا۔ بلکہ یہ انعام و اکرام ڈاکٹر صاحب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے رہے ۔ یہ انعام و اکرام ڈاکٹر صاحب کے لیے باعثِ افتخار نہیں بلکہ انعامات و اکرام کے لیے یہ باعث عزت و افتخار ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے چنے گئے ۔ ادبی و سرکاری، کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں ۔ لیکن نہ کبھی اس کا تذکرہ کیا ۔ نہ زیبِ قلم لائے ۔ وہ یقیناً دنیائے ادب کے صوفی و قلندر رہے ۔ ان کا مسلک دنیا میں علم و آگہی کا فروغ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نسلوں کی ذہنی تربیت کی اور اپنے مخصوص انداز میں لاکھوں ذہنوں کو جلا بخشی ہے آج کے لوگوں کے لیے یہی بہت بڑی بات ہے کہ ہم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے دور میں سانس لے رہے ہیں ۔ انھیں دیکھا ہے اور ان کے قدموں میں بیٹھے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تعلیم و تربیت کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں میری کیا مجال کہ اظہارِ خیال کروں ۔ بس اتنا جانتا ہوں ۔ ان کے قول و عمل میں ذرا برابر فرق نہ پایا۔ علمی زندگی میں بھی ویسا ہی پایا ۔ جیسا تحریر و تقریر میں معتبر، باوقار، دیانت دار، اور مصلحت سے بے نیاز ۔

ڈاکٹر صاحب جیسی قابلِ احترام شخصیتوں کے قدموں میں چند ساعتیں گزارنے کی سعادت بڑی نعمت ہے اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے یہ نعمت نصیب رہی اور آج بھی میرا مقدر ہے۔

پاکستان میں اردو تحقیق

از

ڈاکٹر معین الدین عقیل

قیمت : ۳۰ روپے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ ۔ کراچی

اقبالیات

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

سیّد وقار عظیم سے اقبالیات پر ایک مصاحبہ

۱۹۷۳ء میں جب راقم الحروف گورنمنٹ کالج سرگودھا کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھا، کالج میگزین "ضیا بار" کا اقبال نمبر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مجلسِ ادارت کی طرف سے ممتاز اقبال شناسوں اور اردو کے نامور نقادوں سے غیر مطبوعہ مضامین کے لیے درخواست کی گئی۔ بعد ازاں اسی سلسلے میں راقم الحروف نے لاہور آکر مختلف اہلِ قلم سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان ایام میں بھی بے حد مصروف تھے، اس لیے ان سے کوئی مضمون نہ مل سکا۔ اس پر میں نے اقبالیات سے متعلق بعض سوالات ان کے سامنے پیش کیے۔ وقار صاحب کے جوابات سے گفتگو متعیّن سوالات تک محدود نہ رہ سکی۔ میں نے ضمناً مزید کئی استفسارات کیے اور یہ بات چیت پھیل کر ایک مفصّل مصاحبے (انٹرویو) کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ مصاحبہ "ضیا بار" میں شامل نہ ہو سکا اور اب تک میرے پاس محفوظ رہا۔ یہ مصاحبہ یکم اپریل ۱۹۷۳ء کو لاہور میں کیا گیا۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم (۱۹۱۰ء تا ۱۹۷۶ء) کا انتقال نومبر کے مہینے میں ہوا۔

س۔ اقبال کے کلام سے آپ کا اوّلیں تعارف کب اور کس زمانے میں ہوا اور کس طرح؟

ج۔ یہ ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء کا زمانہ تھا۔ میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہماری نصابی کتاب میں اقبال کا منتخب کلام شامل تھا۔ یہ انتخاب چند نظموں "بچے کی دعا"، "ترانۂ ہندی"، "نیا شوالہ"، "جگنو"، "ہمالہ" اور "ایک آرزو" پر مشتمل تھا۔ یہیں سے اقبال کے ساتھ میری دل چسپی کا آغاز ہوا۔

کلامِ اقبال سے میری دل چسپی کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ اس زمانے میں طُغروں وغیرہ سے گھروں کی آرائش کا بہت رواج تھا۔ ہمارے گھر کے مختلف کمرے تاج کمپنی کے رنگین مطبوعہ قطعات سے مزیّن تھے۔ بعض کتبوں پر قرآن کی آیات، کچھ کتبوں پر سعدی کے، اور بعض پر اقبال کے اشعار درج تھے۔ چناں چہ مجھے اقبال کے وہ سارے شعر زبانی یاد ہو گئے جو کتبوں پر لکھے تھے، اور میں انھیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا۔

س۔ اسکول کے زمانے میں کلام اقبال سے آپ کو جو دل چسپی پیدا ہوئی، آگے چل کر اس نے کیا رخ اختیار کیا؟

ج۔ یہ تعلق بدستور قائم رہا، بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ہوا یوں کہ جب میں نے ایف اے میں داخلہ لیا تو اقبر میرٹھی ہمارے استاد تھے۔ وہ شعر و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ افسانے سے بھی انھیں خاص دل چسپی تھی۔ ان کی کلاس میں ہم بیس پچیس لڑکے تھے۔ وہ سبق پڑھاتے ہوئے ہمیں بچوں کی نظمیں بھی سناتے تھے۔ یہ نظمیں اسماعیل میرٹھی، اقبال اور خود ان کی اپنی ہوتیں۔ اس طرح اقبال کی مزید نظمیں سننے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ پھر ہمارے اردو کے نصاب میں اقبال کی بعض نظموں مثلاً "خضرِ راہ" اور "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے کچھ حصے اور کچھ غزلیں شامل تھیں۔ اقبر میرٹھی صاحب کی عادت تھی کہ جس شاعر کا کلام پڑھاتے اس پر زبانی گفتگو کرتے۔ ان شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام لا لا کر ہمیں دکھاتے۔ اس طرح نئی کتابوں کو دیکھ کر ہمیں بھی وہ کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔

س۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لیے کتابیں دے دیا کرتے تھے؟

ج۔ جی ہاں، جن لڑکوں کو پڑھنے کا شوق تھا، اقبر میرٹھی صاحب انھیں کتابیں دے دیتے تھے۔ اقبر صاحب اور ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے اس لیے آنا جانا تھا اور مجھے ان سے کتابیں لینے میں ایک سہولت تھی۔

س۔ کیا بی۔ اے میں بھی آپ کو کلامِ اقبال، نصاب کے طور پر پڑھنے کا موقع ملا؟

ج۔ بی۔ اے میں بھی اردو نظم و نثر کی بہت سی چیزیں پڑھیں۔ ان میں میر انیس کے دو مرثیے "مسدس حالی"، میر درد کا دیوان، غالب کی بعض غزلیں "مقدمۂ شعر و شاعری" اور خطوطِ غالب شامل تھے۔ بی۔ اے میں ہمارے استاد مولوی محمد حسین اور سید مسعود حسن رضوی ادیب تھے۔ مولوی صاحب اشعار پڑھاتے ہوئے مختلف شعرا اور ان کے کلام کا باہمی موازنہ کرتے جاتے تھے۔ چناں چہ اس زمانے میں شاعری کے بارے میں بعض ایسی باتیں ذہن میں آئیں اور معلوم ہوئیں جو اس تسلسل کے ساتھ اس سے پہلے کبھی ذہن میں نہیں آئی تھیں۔ مولوی صاحب شاعری پڑھاتے ہوئے انیس اور اقبال کا خصوصی ذکر کرتے۔ ان کے کلام کا آپس میں مقابلہ کرتے۔ انیس اور چکبست اور چکبست اور اقبال کے بعض بند تقابلی حیثیت سے پڑھ کر سناتے۔

س۔ آپ نے جب ایم۔ اے کیا تو کیا اس زمانے میں بھی اقبالیات کا پورا پرچہ نصاب میں شامل تھا؟

ج۔ جی نہیں، ہمارے زمانے میں ایم۔ اے میں اقبالیات کا الگ پرچہ تو نصاب میں شامل نہیں تھا، البتہ اُس زمانے میں ایم۔ اے (پریویس) میں ایک پورا پرچہ جدید شاعری کا تھا۔ اس میں عزیز لکھنوی کی "گل کدہ"، چکبست کی "صبحِ وطن"، اقبال کی "بانگِ درا" اور اکبر کی "کلیات" کے تیسرے حصے کا مطالعہ شاملِ نصاب تھا۔ چناں چہ ان شعرا کے مطالعے کے سلسلے میں پوری قومی شاعری کا مطالعہ کیا۔ ایم۔ اے میں ہمارے ایک استاد تھے۔ پروفیسر سید ضامن علی، وہ کچھ زیادہ معروف تو نہیں، لیکن اردو زبان و ادب کی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انھوں نے ایک ہی کتاب "اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ" لکھی جسے ہندوستانی اکیڈمی

نے شائع کیا تھا۔ یہ کوئی دو سو صفحے کی کتاب تھی۔ اس میں پہلی مرتبہ یہ بات بتائی گئی کہ اردو میں مختلف علوم پر کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کتاب دوبارہ شائع نہیں ہوئی۔

س۔ آپ نے جامعہ میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا تو کیا آپ کو اقبال کے مزید مطالعے کا موقع ملا؟

ج۔ جامعہ میں پڑھانے سے پہلے جب میں ایم۔ اے کر چکا تھا تو خواجہ غلام السیدین صاحب سے ملاقات ہوئی، بلکہ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار مجھے پوچھنے لگے کہ اب کیا ارادہ ہے؟ اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں یہ قاعدہ تھا کہ جو طالب علم ایم۔ اے میں اوّل آتا اسے دو سال تک وظیفہ ملتا تھا تاکہ وہ کوئی تحقیقی مقالہ لکھ سکے۔ تو مجھے بھی وظیفہ ملا تھا۔ اور میں ان دنوں مقالہ لکھ رہا تھا۔ چناں چہ میں نے غلام السیدین سے کہا: "مقالہ لکھ رہا ہوں" انھوں نے پوچھا کہ اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا۔ جب اس کام سے فارغ ہوا تو ملازمت کر لوں گا۔ ابھی مقالے کی ترتیب و تسوید سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی اور اس پر میرا تقرر ہو گیا۔ چھے ماہ بعد پھر خواجہ غلام السیدین سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بی ٹی میں داخلہ لے لو۔ وہ اس زمانے میں ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے۔ ان دنوں الہ آباد، بنارس اور علی گڑھ تین مقامات پر بی ٹی (موجودہ بی۔ ایڈ) کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ بنارس اور الہ آباد میں عربی، فارسی یا اردو والوں کو داخلہ ذرا مشکل سے ملتا تھا، مگر علی گڑھ میں ایسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ چناں چہ میں نے علی گڑھ میں بی ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سیدین صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں انھیں اقبال سے بطور خاص دل چسپی تھی۔ وہ اپنے اسباق میں اقبال کا بہت ذکر کرتے تھے۔ ان کا لیکچر تو انگریزی میں ہوتا تھا مگر وہ اقبال کے اقتباسات سناتے۔ وہ پرنسپلز آف ایجوکیشن کا پرچہ پڑھاتے تھے جس میں دنیا بھر کے نظام ہائے تعلیم اور ان کے ارتقا پر بحث ہوتی۔ سیدین صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آج کل کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں مادی قدروں پر زور دیا جاتا ہے۔ مگر یہ نقصان دہ ہے۔ ایک بار انھوں نے اپنے لیکچر میں اقبال کی نظم "عہدِ حاضر کا انسان" پڑھ کر سنائی۔ ہمارے ایک اور استاد تھے، حفیظ سیّد۔ وہ مجھ سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ "ضربِ کلیم" چھپ کر آئی تو انھوں نے اس کے دو نسخے خریدے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنے دستخطوں سے مجھے دیا کہ تمہارے شوق کے پیشِ نظر دیتا ہوں۔ "ضربِ کلیم" کے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ تو اس زمانے میں سیدین صاحب کی وجہ سے اقبال سے شغف اور بھی بڑھتا گیا۔ پھر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، معین احسن جذبی اور اختر انصاری وغیرہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ سب کبھی سیدین کے ہاں اور کبھی خواجہ صاحب کے ہاں جمع ہوتے۔ ان محفلوں میں اقبال کا ذکر آتا۔ ہر ایک کو اقبال سے دل چسپی تھی۔ خصوصاً سرور صاحب اور سیدین صاحب کو تو خاص دل چسپی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے بی ٹی کیا، اور گھر پر تھا کہ سیدین صاحب کا خط آیا کہ جامعہ ملیہ دہلی میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہے۔ وہاں چلے جاؤ تو بہتر ہے۔ چناں چہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں، میں وہاں چلا گیا اور چار سال

جامعہ میں گزارے۔ جامعہ میں قیام کے دوران میں اقبال سے وابستگی اور گہری ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کی موجودگی بھی تھی۔ میں نے اسی زمانے میں اقبال کے سب مجموعے جمع کیے اور ان کو پڑھا۔

پھر جامعہ سے میں پولی ٹکنیک (دہلی) میں چلا گیا۔ حمید احمد خاں صاحب بھی وہاں آگئے۔ بعض لوگ ریڈیو میں تھے۔ مثلاً حامد علی خاں، پطرس بخاری، فیضؔ اور چراغ حسن حسرتؔ وغیرہ۔ دلّی میں ایک صاحب تھے عبدالواحد۔ ہر ماہ ایک بار ان کے گھر ایک ادبی نشست ہوتی جس میں کوئی ادبی مضمون پڑھا جاتا۔ مجھے ان نشستوں میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ تین چار سال تک یہ محفلیں ہوتی رہیں۔ نئے ادیب بیشتر دلی میں جمع تھے۔ ان نشستوں اور ادبی محفلوں میں برابر اقبال کا ذکر ہوتا۔ یوں اقبال سے دلچسپی میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔

س۔ یہاں اورینٹل کالج میں آپ ایم۔ اے اردو کے طلبہ کو ایک طویل عرصے تک اقبالیات کا پرچہ پڑھاتے رہے اس دوران میں آپ کو کبھی کوئی تدریسی مشکل یا دقت پیش آئی ہو؟

ج۔ پڑھانے کے لیے مجھے اقبال اور اقبالیات کا مزید مطالعہ کرنا پڑا۔ یہ مطالعہ اور غور و فکر میں نے برابر جاری رکھا۔ تدریس کے دوران اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات پوچھی جس کا فوری طور پر جواب دینے میں اطمینان نہ ہوا تو میں نے کبھی تکلّف سے کام نہیں لیا۔ طلبہ سے صاف کہہ دیا کہ مزید غور و فکر کر کے بتاؤں گا۔ جب تک طبیعت کا اطمینان نہیں ہوا۔ طلبہ کو سرسری جواب نہیں دیا۔

س۔ علاّمہ اقبال کے خطبات کی زبان خاصی مشکل ہے اور پہلی بار انھیں سمجھ لینا آسان نہیں۔ اور پھر ان کا اردو ترجمہ جو سیّد نذیر نیازی صاحب نے کیا، وہ بھی آسان نہیں بلکہ بعض اوقات تو کہا جاتا ہے کہ اردو ترجمہ انگریزی سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کے مطالب اس سے پہلے اردو میں پیش نہیں کیے گئے اور اردو خواں طبقے کے سامنے انگریزی میں بھی ایسے مطالب کبھی سامنے نہیں آئے۔ اقبال کا اسلوب ایک ایسے آدمی کا اسلوب ہے جو ہر بات کو فلسفی کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر مسئلے پر مفکر کی حیثیت سے غور کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ذہن میں کچھ چیزیں محفوظ ہوتی ہیں، وہ ان کا اظہار بعض الفاظ کے ذریعے کرتا ہے۔ اپنی طرف سے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے بات پوری طرح بیان کر دی مگر کچھ چیزیں اس کے ذہن ہی میں رہتی ہیں، جو اس بات کا اصل پس منظر ہوتا ہے۔ چناں چہ اس وجہ سے عام قاری انھیں سمجھنے میں دقّت محسوس کرتا ہے۔ اس مشکل کو آسان بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کلامِ اقبال کے علاوہ ان کے خطوں اور بیانات کو پڑھا جائے جو انھوں نے اپنے فلسفے کی توضیح و تشریح میں لکھے ہیں۔ درحقیقت یہ خطبات ایک دفعہ پڑھنے کے بعد تو وافعی سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر دو چار بار پڑھنے سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے "فکرِ اقبال" میں خطباتِ اقبال کا جو خلاصہ دیا ہے

وہ عام اردو قاری کے لیے بہت اچھا ہے۔

س۔ تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ترجمہ ناقص ہے اور وہ خطبات کی تفہیم میں مدد نہیں دیتا؟

ج۔ یہ بات تو نہیں کیوں کہ نذیر نیازی صاحب نے اقبال کے کہنے پر ہی ترجمہ شروع کیا تھا اور کچھ حصّوں کا ترجمہ انھوں نے خود بھی دیکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ جو اصطلاحیں اردو ترجمے میں استعمال کی گئی ہیں ان سے لوگ مانوس نہیں۔ انگریزی اصطلاح کا مفہوم ذہن میں واضح ہوتا ہے لیکن اردو کی اصطلاح کا مفہوم اور اس کے متعلقات خود فراہم کرنے پڑتے ہیں اس لیے دقّت ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حمید احمد خاں صاحب ترجمہ کریں تو وہ نہایت عمدہ ہوگا۔

حال ہی میں مجلسِ ترقیِ ادب نے خطبات اقبال کے ترجمے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں ہر خطبے کا ترجمہ الگ الگ آدمی سے کرایا جائے گا۔ ترجمہ کرنے والوں میں شیخ محمد سعید صاحب، ڈاکٹر محمد اجمل صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب وغیرہ شامل ہیں۔ ایک باب کا ترجمہ میرے سپرد بھی کیا گیا ہے۔[1]

س۔ اس صورت میں جب ہر باب کا ترجمہ الگ الگ مترجم کریں گے، امکان ہے کہ اصطلاحات کے تراجم میں اختلاف واقع ہو اور قارئین اس سے پریشان ہوں؟

ج۔ جی ہاں، اصطلاحات کے ترجمے متعیّن کیے جاسکتے ہیں اور پھر آخر میں پورا مسوّدہ دیکھ کر درست کر لیا جائے گا۔ اس لیے امید ہے کہ ترجمے میں کوئی اجنبیت نہیں رہے گی۔

س۔ اقبال کے یومِ پیدائش کے بارے میں خاصا اختلاف واقع ہوا ہے۔ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ صحیح یومِ پیدائش کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ تاریخِ پیدائش کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ ۱۸۷۵ء والی روایت تو خاصی کمزور ہے۔ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں جو اندراجات ہیں ان کے مطابق ۱۸۷۳ء کے سال میں دو لڑکوں کی پیدائش دکھائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شیخ نور محمد کے لڑکے تھے اور ان میں ایک اقبال تھے۔ دونوں بچّوں کی پیدائش کے درمیان دس مہینے کا وقفہ ہے، اور یہ بات کچھ دل کو لگتی ہے۔ اب اگر اس بات کی تحقیق ہو جائے کہ ان دونوں میں سے ایک تو شیخ نور محمد کا لڑکا تھا اور دوسرا کسی اور نور محمد کا، تو پھر اقبال کا یومِ پیدائش ۱۸۷۳ء ہی درست ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک بات اور ہے اور وہ یہ کہ اقبال کی زندگی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہندوستان بھر میں پہلا یومِ اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر لاہور کی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کی طرف سے "مقالاتِ یومِ اقبال" نام کا جو مجموعہ چھپا، اس کے دیباچے میں کہا گیا تھا کہ اقبال نے زندگی کی ۶۵ منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس حساب سے ان کا سالِ پیدائش ۱۸۷۳ء بنتا ہے۔ یہ بات اقبال کی زندگی میں ہی کہہ دی گئی اور

---

[1] یہ منصوبہ روبہ عمل نہ آسکا۔ اب اقبال اکادمی پاکستان، ترجمے کے ایک منصوبے پر کام کرا رہی ہے۔

وہ اس پر خاموش رہے۔ گویا اس بات کو خود ان کی تائید بھی حاصل ہے۔ اس لحاظ سے تو ۱۸۷۳ء ہی درست ہے۔[1]

س۔ مگر کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کو اپنی تاریخِ پیدائش کے بارے میں صحیح اندازہ نہ تھا کیوں کہ اس سے پہلے وہ اپنا سنہ پیدائش ۱۸۷۶ء لکھ چکے تھے؟

ج۔ جی ہاں، اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے شروع میں جو اپنے مختصر حالاتِ زندگی لکھے اس میں انھوں نے اپنے ہجری سنہ پیدائش کے ساتھ بریکٹ میں عیسوی سنہ ۱۸۷۶ء لکھ دیا۔ مگر دونوں میں مطابقت نہیں تھی۔ اس پر بہت بحث ہوئی ہے۔ دراصل اقبال نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سنا، انھوں نے وہی لکھ دیا۔ لہٰذا ان کا اپنا لکھنا یا کہنا سو فی صد درست نہیں۔ تاوقتیکہ اس کی تائید میں اور باتیں نہ ملیں۔

س۔ گویا اب یہ ایک بڑا اختلافی مسئلہ بن چکا ہے، تو اس پر حتمی فیصلے کی کیا صورت ہے؟

ج۔ اس معاملے میں تحقیق کرنے کے لیے بزمِ اقبال (لاہور) نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کے تین پراجلاس ہو چکے ہیں۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ نذیر نیازی صاحب اور پروفیسر محمد عثمان صاحب سیالکوٹ جائیں، اور وہاں بعض افراد خصوصاً خاندانِ اقبال کے افراد سے مل کر، سوالات کر کے تحقیق کر لیں اور پھر اس رپورٹ کی روشنی میں کمیٹی کوئی فیصلہ کرے گی۔ اندازہ ہے کہ اس میں تقریباً ایک ماہ لگے گا۔[2]

س۔ اچھا وقار صاحب، آپ کو طالب علمی کے زمانے سے معلّمی کے دور تک اقبالیات سے بڑا شغف رہا اور اب بھی بدستور ہے، کیا علامہ اقبال سے کبھی آپ کی بالمشافہ ملاقات بھی ہوئی؟

ج۔ جی نہیں، یہ میری ایک محرومی ہے کہ اقبال سے ملاقات کبھی نہیں ہو سکی۔ میرا طالب علمی کا سارا زمانہ یوپی میں گزرا کیوں کہ میرے والد صاحب وہیں ملازم تھے۔ اقبال اس زمانے میں اس علاقے میں نہیں گئے اور مجھے پنجاب آنے کا موقع نہ ملا۔ ویسے تو میں نے اس زمانے کا ہر بڑا مشاعرہ سنا اور تقریباً تمام قابلِ ذکر شعرا کو دیکھا، مگر اقبال مشاعروں میں نہیں جاتے تھے۔ اس لیے ان کی زیارت نہ ہو سکی۔ بعد میں جب ہوش آیا اور اقبال کی قدر ہوئی تو وہ دور گزر چکا تھا۔ اقبال فوت ہو چکے تھے۔

س۔ جیسا کہ آپ نے ابھی بتایا، ایک روایت کے مطابق اور یہ روایت زیادہ قوی ہے۔ اقبال کا سنہ پیدائش ۱۸۷۳ء ہے۔ اس حساب سے موجودہ سال یعنی ۱۹۷۳ء ان کا صد سالہ سالِ پیدائش بنتا ہے۔ بعض ادارے اسی نسبت سے اقبال صدی کی تقریبات کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ہمارے کالج میگزین[3] کا اقبال نمبر بھی کالج میں

---

[1] اگرچہ حکومتِ پاکستان نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی کو یومِ ولادتِ اقبال قرار دیا۔ اور اقبال صدی بھی اس کے مطابق منائی گئی۔ مگر ہمارے بعض نامور محققین ۱۸۷۳ء کے حق میں ہیں۔ دیکھیے: ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کا شمیری کے مضامین "نقوش" اقبال نمبر (۱) ۱۹۷۷ء

[2] اس کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے بعد ۱۸۷۷ء کو اقبال کا سالِ ولادت قرار دیا تھا۔

[3] "دھنیا بار"، مجلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا۔

اقبال صدی کی تقریبات کا ایک حصّہ ہے۔ مگر ملک میں، خصوصاً علمی و ادبی حلقوں میں وہ جوش و خروش اور اہتمام نظر نہیں آتا جو غالب صدی کے موقع پر نظر آیا تھا۔ آپ کے خیال میں اس کا سبب کیا ہے؟

ج۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی نہیں کہ علمی و ادبی حلقے کچھ کام ہی نہ کر رہے ہوں۔ مجلسِ ترقیٔ ادب ۱۹۷۳ء کے حساب ہی سے اقبالیات پر بعض کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام کر رہی ہے۔ وہ اس سلسلے کا ایک اہم کام اقبال کی نوٹ بک (STRAY REFLECTIONS) کا اردو ترجمہ ہے جو مجلس کے لیے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب نے کیا ہے[1]۔ پھر حمید احمد خاں صاحب نے اقبال پر جو مضامین لکھے ان کا مجموعہ بھی شائع ہو گا[2]۔ اسی طرح اقبالیات پر ان مضامین کا مجموعہ جو اقبال کی زندگی میں ہی شائع ہو چکے تھے[3]۔ اسی طرح مجلس کا رسالہ "صحیفہ" اقبال نمبر شائع کر رہا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے غالب صدی منانے کا پُرجوش اہتمام اس لیے بھی کیا تھا کہ حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر تھے، اس وقت اگر وہی صورت ہوتی تو ممکن تھا کہ اقبال صدی کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش اور اہتمام کیا جاتا۔

س۔ اقبالیات سے دل چسپی اور شغف کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ اقبال پر کس قدر تحقیقی و تنقیدی کام ہوا؟ آپ کے خیال میں اس ضمن میں جو کام ہوا، کیا وہ بہت کم نہیں۔ اور اقبال سے عدم دل چسپی کا ثبوت نہیں مہیّا کرتا؟

ج۔ بات یہ ہے کہ اقبال کی وفات کو صرف ۳۵ سال گزرے ہیں، مگر اس عرصے میں اقبال پر اس قدر لکھا جا چکا ہے جتنا غالب کی وفات کے ۳۵ سال بعد تک یقیناً نہیں لکھا گیا تھا۔ بلکہ وہ اس کے مقابلے پر بہت ہی کم تھا۔ یوں آپ دیکھیں کہ اس طرح اقبال کے مختلف پہلوؤں پر پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے چالیس پچاس سے اوپر مقالات لکھے گئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو اقبال سے کتنی دل چسپی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام شوق اور وابستگی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اقبال پر تحقیقی کام نہیں ہوا۔

پھر آپ دیکھیں کہ اقبال اکادمی کراچی نے اقبال پر خاصی بڑی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں۔ اقبالیات پر اب تک جو لٹریچر شائع ہوا ہے اس سے ایک بات بڑی وضاحت سے طے کر دی گئی ہے کہ اقبال کا اسلام سے بڑا گہرا تعلق تھا اور انھوں نے قیامِ پاکستان پر بڑا زور دیا اور اس کی تخلیق میں ان کا بڑا دخل ہے۔

س۔ ہندوستان میں آپ کی معلومات کے مطابق اقبال پر کچھ کام ہوا ہے؟

---

[1] "شذراتِ فکرِ اقبال"، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۷۳ء ص ۲۷

[2] "اقبال کی شخصیت اور شاعری"، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۷۴ء ص ۱۹۴

[3] "اقبال معاصرین کی نظر میں"، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۷۳ء ص ۵۴۳

ج۔ ہاں، پی ایچ ڈی کے چند مقالات لکھے گئے ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کا "مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال"[1] ہے۔ دوسرا ڈاکٹر عبدالحق (دلّی یونیورسٹی) کا "اقبال کے ابتدائی افکار"[2] ہے۔ اس کے علاوہ بعض لوگ اقبال پر مسلسل لکھتے رہے ہیں، جن میں سیّدین صاحب (مرحوم)، سرور صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اقبال سے ان کی وابستگی قائم ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقبال پر بعض لوگ اس لیے بھی کھل کر نہیں لکھتے کہ اعتراضات کا خدشہ ہوتا ہے اور لوگوں کو ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں جن سے اقبال کی زندگی کا بے تکلفانہ پہلو سامنے آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر انسانی کمزوریاں بھی تھیں۔ مثلاً خان نیاز الدین خاں مرحوم کے نام خطوں میں اقبال کبوتروں کا ذکر بڑے شوق اور دل چسپی کے ساتھ برابر کرتے ہیں۔ اسی طرح جب میں "ماہِ نو" میں تھا تو ایک بار مرزا جلال الدین سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے پاس اقبال سے متعلق بعض ایسی چیزیں ہیں جو اور کسی کے پاس نہ ہوں گی۔ مگر انھیں منظرِ عام پر لانا اس لیے مشکل ہے کہ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی۔ تو بات یہ ہے کہ اقبال ہمارا ہیرو ہے مگر جو لوگ ان کے بارے میں سچّی بات کہتے ہوئے ڈرتے ہیں، شاید وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی عظمت میں فرق آجائے گا، درحقیقت وہ اقبال کی عظمت کو نہیں پہچانتے۔ اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ ان کی زندگی اور شخصیت کی سچّی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی جائے۔

س۔ علّامہ اقبال کے خطوں کا آپ نے ذکر کیا، ان کے خطوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر بعض خطوں کو پڑھتے ہوئے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور کئی باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان خطوں کو حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جائے؟

ج۔ جی ہاں، یہ بہت ضروری ہے کہ خطوں پر حواشی لکھے جائیں۔ میں نے ابھی جس مجموعۂ مضامین[3] کا ذکر کیا، اس میں میں نے حواشی کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً اقبال نے کہیں لکھا کہ فلاں کتاب میں یہ بات آئی ہے تو میں نے وہ کتاب نکال کر اس میں سے متعلقہ بات حاشیے میں لکھ دی۔ خطوں کو بھی اسی طرح مرتّب ہونا چاہیے۔

س۔ آپ کے پیشِ نظر اقبال کے کسی موضوع پر کوئی ایسا کام ہے جسے آپ کر رہے ہوں یا کرنا چاہتے ہوں؟

ج۔ جی ہاں، میرے ذہن میں اقبال کے بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ میں اس انداز میں لکھنا چاہتا ہوں کہ طلبہ کی سمجھ میں آجائے۔ کیوں کہ میرے تجربے کے مطابق بعض مقامات ایسے ہیں جہاں

---

[1] حال ہی میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے اس کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

[2] مطبوعہ جون پور (بھارت) ۱۹۶۹ء ص ۲۹۶

[3] "اقبال معاصرین کی نظر میں" (مرتّبہ: سیّد وقار عظیم)

طلبہ کو الجھن ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ طلبہ کی ایسی الجھنیں دُور کرنے کے لیے کچھ لکھ سکوں تو یہ بڑا مفید کام ہوگا۔ مگر ابھی فرصت میسّر نہیں آ رہی، ذرا یکسوئی نصیب ہو تو اس طرح کے کم از کم چار پانچ مضمون لکھوں گا۔[1]

س۔ اقبال پر کوئی اور ایسا کام جس کا ہونا آپ ضروری سمجھتے ہیں؟

ج جی ہاں کئی ضروری کام ہیں۔ ایک بار مجلسِ ترقیٔ ادب نے یہ طے کیا تھا کہ دیہات میں اقبال کا کلام پہنچانے کے لیے اس کے ترجمے علاقائی زبانوں مثلاً پشتو اور پنجابی میں وسیع پیمانے پر شائع کیے جائیں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اقبال کی ایک ایک کتاب کا پورا ترجمہ شائع کرنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اقبال کے پورے کلام سے ایسے آسان حصّے انتخاب کیے جائیں جو دیہاتیوں کے مزاج کے مطابق ہوں اور جنھیں وہ آسانی سے سمجھ سکیں۔ ان منتخب حصّوں کے ترجمے کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے مجلس کچھ کام کرے گی۔ ایک کام اور ہے جو بڑا ضروری ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ وہ ہے اقبال پر مغربی شعرا اور مفکّروں کے اثرات ——— اس موضوع پر کافی لکھا گیا ہے[2]۔ مگر مزید گہرے تحقیقی مطالعے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے لیے کلامِ اقبال کی اہمیت واضح کی جائے اور بتایا جائے کہ نوجوانوں کے لیے اور مسلمانوں کے لیے اقبال کا کیا پیغام ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ صرف اسی طرح مطالعۂ اقبال کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔

---

[1] "اقبال، شاعر اور فلسفی" (لاہور ۱۹۶۸ء) کے بعد اقبالیات پر وقار صاحب کا دوسرا مجموعۂ مضامین (مرتّبہ: ڈاکٹر سیّد معین الرّحمٰن) ۱۹۷۷ء میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے شائع ہوا ص ۳۶۴

[2] ۱۹۷۵ء میں اس موضوع پر جگن ناتھ آزاد کی ایک کتاب "اقبال اور مغربی مفکّرین" شائع ہوئی۔ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ ۱۹۷۵ء ص ۱۹۰)

تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت
(جلد اوّل)

از: سیّد ہاشمی فرید آبادی

قیمت: ۶۵ روپے

انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

آصف فرخی

مجھے گھر یاد آتا ہے

بات چلی تھی ایک شاعر کی دعا سے۔ یوں تو شعر گوئی کا عمل ہی ایک قسم کی مناجات ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو شاعر اصل معنوں میں اہلِ دعا ہے۔ وہ دنیا ہو کہ دیس کہ گھر، ان کی دعائیں سایۂ اماں بن کر اپنی پناہوں میں لیے رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک خواہش کا اظہار اس شاعر نے اپنی دعا میں کیا تھا کہ خدایا، میں جس مکان میں رہتا ہوں اسے گھر بنا دے۔ کیسی عجیب دعا ہے۔ دو لفظ جو بظاہر ایک جیسے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے۔ مکان محض در و دیوار کا مجموعہ ہے، لیکن گھر کی تعمیر میں سنگ و خشت کے علاوہ محبّت اور اپنائیت شامل ہے۔ مکان سے گھر بننے تک کا عمل افراد کے سہارے ہی ممکن ہوتا ہے۔ کچھ اسی نتیجے پر اقبال بھی پہنچے تھے جب انھوں نے اپنے ایک رفیق کے نام خط میں لکھا کہ جب سے یہ جرمن خاتون آئی ہیں، میرا گھر دوبارہ سے گھر معلوم ہونے لگا ہے۔ اقبال کے سوانح نگار بتاتے ہیں کہ والدۂ جاوید کے انتقال کے بعد سے اقبال کو مسلسل کسی ایسی شخصیت کی تلاش تھی جو ان کے گھر کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ سکے اور گھرداری کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

اقبال کی ذہنی جستجو کا محور و مرکز جدید میں بندۂ مومن کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ جب کہ ان کی یہ ذاتی مشکل اس تلاش کا وہ دوسرا رُخ ہے۔ روشن سیاروں کے اندھیرے نصف کُرّے کی طرح۔ بندۂ مومن کی تلاش میں کچھ عملی مضمرات بھی ہوتے ہیں! یہ خیال آتے ہی ہم یہ تصوّر باندھنا شروع کر دیتے ہیں کہ کیا اقبال کا گھرانا اس ڈائیلما سے دوچار ہوا؟ کیسا تھا اس شاعر کا گھر؟

یہ اُن جرمن خاتون کا ذکر ہے، کہ جنھوں نے کئی برس تک اقبال کے گھر کو گھر بنائے رکھا، وہ اب برلن میں رہ رہی ہیں۔ میری ان سے ٹیلی فون پر کئی بار بات ہوئی تھی اور یہ طے تھا کہ میں ہیم برگ سے واپس آؤں گا تو ان سے ملوں گا۔ ان خاتون کا نام ہے ڈورس احمد۔ اور یہ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک خانوادۂ اقبال کی دیکھ بھال کرتی رہی ہیں۔ وہ جاوید اور منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے جاوید منزل آئی تھیں اور جلد ہی ایک فردِ خاندان کی سی حیثیت اختیار کر گئیں، کہ انھیں عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود اقبال کی نظر میں ان کی اس درجہ قدر و منزلت تھی کہ انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان کے انتقال کے بعد بھی بچّوں کی نگہداشت کرتی رہیں۔ ڈورس احمد

نے اس خواہش کا احترام کیا اور اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ اسی گھر میں گزارا، جواب ان کے لیے اپنے ہی گھر بار کی طرح ہو گیا تھا۔ اِن دنوں جب کہ وہ خاموش ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہیں، یہ گھر ان کی یادوں کا محور ہے۔ اب بھی یہ عالم ہے کہ ان سے جو بات کی جائے وہ گھوم پھر کر جاوید منزل اور اس کے باسیوں کی طرف آجاتی ہے اگرچہ جاوید منزل اب ان کے لیے چھوڑی ہوئی منزل ہے۔ لیکن ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے شمیم حنفی صاحب کا ریڈیائی ڈرامہ "مجھے گھر یاد آتا ہے" یاد آیا۔ ڈورس احمد کی تمام گفتگو اسی عنوان کے تحت ہے۔

ان کے بقول یہ یادیں ان کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ زندگی کا فعّال اور مستعد حصہ بیت جائے تو اس کی یادیں چھتنار درخت بن جاتی ہیں کہ ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں سستانے سے آرام ملتا ہے۔ اچھی گزری ہو کہ خراب۔ ایسے وقت میں انسان کی یادیں ہی اس کو اپنا سرمایہ اور سہارا محسوس ہوتی ہیں کہ ان یادوں میں زندگی کے سارے عمل کی معنویت مضمر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جاوید منزل میں گزارے ہوئے ان برسوں کی یادیں ڈورس احمد کے لیے تو بیش قیمت ہیں ہی، لیکن ان کی یہ 'یادِ ایام' اس صاحبِ بصیرت شاعر سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھی معنی خیز ہے، جو ان یادوں کا مرکزی حوالہ ہے۔

اقبال کے قد قامت کا شاعر ہمیشہ اپنے کلام کے شائقین کے مخلصانہ تجسّس کا شکار رہتا ہے۔ شاعری کا جادو جب بھی سر چڑھ کے بولتا ہے، پڑھنے والے لفظیات کے طلسم کدے سے آگے جا کر جھانکنا چاہتے ہیں کہ کیسی ہوں گی وہ آنکھیں یہ خواب دیکھنے والی، کیا سوچتا ہوگا ہمارا شاعر۔ سوالات کی یہ یلغار بعض مرتبہ دلِ شاعر کے نازک اور مخفی گوشوں کو بھی نہیں بخشتی اور اپنی تسکین کے لیے حسبِ دل خواہ مواد نہ ملے تو زیبِ داستاں سے بھی گریز نہیں کرتی۔ جیسا کہ غالب کی ممدوحہ، ستم پیشہ ڈومنی کو ہند کے صورت گر و افسانہ نویسوں نے مشخّص کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور تو اور، ایک ناول نگار نے اپنی قوتِ متخیّلہ کے زور پر منصور حلاّج کی ذہنی جستجو میں ایک فلمی ٹائپ کے رومان کے آثار دریافت کر لیے۔ اسی پر بس نہیں، قیاس آرائی اور تجسّس کی یہ یلغار ان تمام لوگوں کو بھی دائرۂ تفتیش و توجہ میں شامل کر لیتی ہے جو کسی نہ کسی طرح اس شاعر کے رابطے میں آئے تھے۔ اس شاعر سے دل چسپی کے ناتے یہ لوگ بھی ہماری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ڈورس احمد کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اقبال سے براہِ راست رابطے کے ذریعے، چوں کہ وہ اقبال کے بارے میں ایک اہم دستاویزی حوالہ ہیں اسی لیے وہ بذاتِ خود بھی اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ جو بھی ذریعہ اقبال کے شخص و شاعر کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بنتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ شاعری کا سحر بہت دُور تک اپنا اثر رکھتا ہے۔ زمانوں کی دُوری پر بھی اور سات سمندر پار بھی۔

ڈورس احمد نے انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے IQBAL — AS I KNEW HIM، جسے اقبال اکادمی نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ (انھوں نے مجھے بتایا کہ پروفیسر این ماری شمل اس کا جرمن میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ یہ کتاب کوئی بہت وقیع علمی دستاویز نہیں لیکن اقبال کے حوالے سے اس کی اشاعت اردو میں بھی ہونی چاہیے)

اقبال صدی کے موقعے پر ۱۹۷۷ء میں حکومتِ پاکستان نے اقبال کے خاندان کے لیے ان کی خدمات کے پیشِ نظر ایک خصوصی تمغہ انھیں دیا تھا۔ وہ کہنے لگیں کہ میں اس اعترافِ خدمت پر بہت متاثر ہوئی۔ کیوں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ میرے لیے "محبت کی محنت" تھی۔ مجھے اور کسی صلے کی آرزو نہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جن کے نتیجے میں وہ جاوید منزل تک پہنچیں: علامہ اقبال ۱۹۳۵ء میں اپنی رفیقۂ حیات سردار بیگم سے محروم ہو گئے۔ ان کے دونوں کمسن بچے جاوید، عمر گیارہ سال اور منیرہ، عمر پانچ سال۔ بن ماں کے رہ گئے۔ یہ بات علامہ اقبال کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ کیوں کہ وہ خود بھی بیمار رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے تمام دوستوں سے کہا کہ کوشش کر کے کسی ایسی مناسب خاتون کا بندوبست کر دیں جو ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے اور گھر چلانے کا ذمہ لے سکے۔ ان دوستوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی شامل تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔

"اس زمانے میں، میں علی گڑھ میں رہ رہی تھی۔ اپنی بہن لیزا کے ساتھ۔ جن کی شادی علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ نباتیات کے سربراہ ڈاکٹر اصغر علی حیدر سے ہوئی تھی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ان کے اہلِ خاندان ہمارے اہلِ خاندان کے بہت دوست تھے۔ انہی کے توسط سے لاہور سے خلیفہ عبدالحکیم نے میرے بہنوئی سے رجوع کیا کہ وہ مجھ سے کہیں کہ میں یہ ذمہ داری سنبھال لوں:"

"صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا کہ علامہ اقبال ہندوستان کے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو جرمنی کے لیے گوئٹے کی ہے۔ ان کے گھر میں کوئی ذمہ داری سنبھالنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اور اگر میں نے یہ قبول کر لیا تو میں ہندوستانی مسلمانوں پر بڑا احسان کروں گی۔ انھوں نے کہا کہ اقبال بہت مشکل میں تھے کہ کوئی ان کے دونوں بچوں کو سنبھال لے جو حال ہی میں ماں کے سائے سے محروم ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال جرمن خواتین کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب انھوں نے میرے بارے میں سنا تو وہ بہت مشتاق تھے کہ میں ان کے گھرانے میں آ کر شامل ہو جاؤں۔"

"ابتدا میں میرے بہنوئی اس بات پر راضی نہیں تھے کہ میں اتنی دور چلی جاؤں۔ نہ ان کو یہ پسند تھا کہ میں کسی قسم کا کام کرنے لگوں۔ لیکن صدیقی صاحب نے ان کو یہ کہہ کر قائل کر دیا کہ میں علامہ اقبال کے خاندان کی خدمت کے لیے جا رہی ہوں۔"

خدمت انھوں نے کی، اور اس جذبۂ جاں فشانی سے کی کہ وہ اس گھرانے کا جزو بن گئیں۔ آج بھی وہ اپنے آپ کو اس گھرانے سے وابستہ پاتی ہیں۔ ان کے ڈرائنگ روم میں جتنی بھی تصویریں لگی ہوتی ہیں وہ سب خانوادۂ اقبال کی ہیں۔

برلن میں قیام کے دوران مجھے ان سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے انھیں ایک خوش مزاج، ملنسار اور عمدہ گفتگو کرنے والی خاتون پایا۔ وہ یوں تو بہ وجوہ پاکستان/ہندوستان سے آنے والے لوگوں سے ملنے میں احتیاط

کرتی ہیں۔ لیکن آنے والے کی نیت کے بارے میں ان کے شکوک رفع ہو جائیں تو بڑے اخلاص کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ میرے لیے ان سے ملاقات یوں ممکن ہوئی کہ میں کراچی سے جناب عدنان علی حیدر کا تعارفی حوالہ لے کر چلا تھا جن کا تعلق علی گڑھ کے اسی گھرانے سے ہے جس کا ذکر ابھی ان خاتون کی یادداشتوں کے حوالے سے آیا۔ عدنان کا نام آتے ہی وہ کھل اٹھیں اور بے حد خوش ہو کر مجھے بتایا کہ میں پاکستان آئی تھی تو عدنان نے نہ صرف اپنی یونیورسٹی کی سیر کرائی اور بہت خیال رکھا بلکہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے آیا تو فلائیٹ اسٹیوارڈ سے کہا کہ میرا خیال رکھیں کہ مجھے دورانِ پرواز تکلیف نہ ہو۔ نہ جانے اس کے کہنے میں کیا تاثیر تھی کہ جہاز کے عملے نے میرا اتنا زیادہ خیال رکھا جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ اور یہ سب عدنان کے کہنے سے ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ واقعی اس نوجوان میں ایسی غیر معمولی صفت ہے کہ اسے دیکھتے ہی اس کا گہرا دیرپا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ عدنان سے میرا استاد شاگرد کا رسمی، روایتی رشتہ دوستی میں اس وقت تبدیل ہوا جب ہم دونوں نے ایک طویل اور تکلیف دہ سفر ساتھ کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ شمالی وادیوں میں سردی ہوگی۔ ہم خوب گرم کپڑے پہن کر روانہ ہوئے تو چیلاس تک پہنچتے پہنچتے گرمی سے اُبلنے لگے۔ چودہ گھنٹے کا وہ گرم، گرد آلود اور پیاسا سفر ہم نے اپنی پسندیدہ کتابوں کے بارے میں باتیں کر کے کاٹا۔ اس سفر نے ہمیں دوست بنا دیا اور اسی دوستی نے میرے واسطے ڈوریس احمد کا دروازہ وا کیا۔

اس دروازے تک پہنچنے کے لیے مجھے بڑی دُور کا سفر کرنا پڑا۔ برلن کی آرائش گاہ جدید سجی بنی SHOW WINDOW جیسی شاہراہ KURFURSTENDAMM سے ٹہلتا ہوا میں ایک باوقار، پُرسکون اور خاموشی میں لپٹی ہوئی فاسانن اسٹراسے (FASANEN STRASSE) میں داخل ہوا۔ دونوں سڑکوں کا تضاد مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ کوڈام کہ برلن کا VANITY FAIR ہے، عہدِ حاضر کی دل رُبا مخلوق۔ رنگ، روشنی، ہجوم۔ دوسری طرف یہ رہائشی عمارتوں کے سلسلے جو درختوں کی چھاؤں میں یوں نظر آتے ہیں کہ جیسے بڑے آرام سے ہیں۔ پرانی طرز کی عمارتوں کے محراب اور FACADES الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان کے درمیان نئی تعمیرات سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ قدیم و جدید کا یوں ایک دوسرے میں خلط ملط ہونا، چاہے معاملہ رہائش کا ہو یا طرزِ حیات کا۔ یہ برلن کا خاص وصف ہے۔ اور شاید اسی لیے کئی بار ایسا ہوا کہ برلن کی سڑکوں پر چلتے چلتے مجھے ایسا لگا کہ میں دلّی میں ہوں۔ عصرِ حاضر کی رسوم و رفتار سے پوری طرح ہم آہنگ شہر جو نیون سائن کی طرح جلتے بجھتے چہرے کے ساتھ اچانک یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ اس کی جڑیں صدیوں میں پیوست ہیں۔ اور صدیوں کی یہ مسافت اس کے سنگ و خشت میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ مجھے ایسے شہر اچھے لگتے ہیں کہ یہیں افسانہ و اساطیر پنپتے ہیں۔ یہاں برپا ہونے والے واقعے یک رُخے معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں اچانک تصادم بھی انکشاف کو جنم دیتا ہے کہ ENCOUNTER فروغ پا کر EPIPHANY میں بدل جاتا ہے۔ قصہ مختصر سو میں یہاں ہوں، شاہراہِ برلن میں۔

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما —

میں نے نچلی منزل پر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اور ایک آواز نے کہا، اُوپر چلے آؤ۔ تیسری منزل تک سیڑھیاں چڑھنا پھر الٹے ہاتھ کو مڑ کر تیسرے دروازے پر دستک دینا۔ سو میں نے اس آواز کی تعمیل کی۔ دروازے پر دستک دی اور مسکراتی ہوئی سفید بالوں والی، مہربان صورت خاتون نے میرا سواگت کیا۔ "السلام علیکم" انھوں نے چھوٹتے ہی بڑے

زوردار طریقے سے سلام کیا۔ آواز میں کرارا پن ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ گٹھیا کے واضح اثر کے باوجود چال ڈھال میں دم خم ہے۔ جھرّیوں بھرا چہرہ مسکراہٹ سے کِھلا پڑ رہا ہے۔ وہ مجھ سے ملی جُلی انگریزی اور اردو میں بات کرتی ہیں۔

"I DIDNT QUITE CATCH YOUR NAME. ACCHA. SO YOU ARE

ASIF SAHIB AAP ASIF SAHIB HAIN."

جملہ اردو کا ہے لیکن طرزِ ادا انگریزی۔ وہ مجھ سے آرام سے بیٹھنے کے لیے کہتی ہیں۔ اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ ڈورِس احمد ان لوگوں میں سے ہیں کہ جن کے ساتھ بہت جلد دوستی اور اخلاص کا ایک تعلّق استوار ہو جاتا ہے۔

وہ بڑے فخر اور مُسرّت کے ساتھ اس عظیم شاعر کے خاندان کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں کہ جس خاندان کے ساتھ وہ ہنوز جذباتی طور پر وابستہ ہیں۔ "جب ڈاکٹر صاحب اور بچّے۔ ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رک جاتی ہیں اور ہنسنے لگتی ہیں "میں ابھی تک انھیں بچّے کہہ رہی ہوں۔ حالاں کہ اب تو ان کے اپنے بچّے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔" وہ بہت خوش ہو کر بتاتی ہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیٹا اعلا تعلیم کے لیے امریکا جاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے آیا، اور منیرہ اقبال کا ایک بچّہ ان سے اس درجہ مانوس ہو گیا تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا تھا۔ یہ ساری باتیں کرتے ہوئے ان کے چہرے کا تاثر قابلِ دید ہے۔ یہ فخر اور مُسرّت کی وہ کیفیت ہے جو ہمارے ملک میں خاندان کی بڑی بوڑھیوں پر اس وقت طاری ہو جاتی ہے جب وہ نئی نسلوں کو اپنے سامنے پھولتے پھلتے ہوئے دیکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اور بچّے۔ ڈورِس احمد کی گفتگو کا محور بھی یہی ہے۔

"پہلے پہل بانو مجھ سے بہت شرماتی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی رہتی اور چُپ چاپ دیکھتی رہتی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ جاوید شروع ہی سے مجھ سے مانوس ہو گیا۔ وہ مجھ سے ہزاروں سوال پوچھتا۔ لیکن بانو مجھ سے نہیں ہلی۔ شاید وہ یہ سمجھتی تھی کہ میں بھی جلدی ہی وہاں سے چلی جاؤں گی۔ ان ہندوستانی اور اینگلو انڈین لڑکیوں کی طرح جو اس کی نگہداشت کے لیے اس سے پہلے آئی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں جا رہی ہوں کیوں کہ یہ لڑکی مجھ سے بول کے نہیں دیتی، مگر انھوں نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ میں اس لڑکی کے روّیے سے بہت پریشان تھی۔ کیوں کہ میں بہت جلد بچوں کو دوست بنا لیتی ہوں۔ اسی لیے تو میں وہاں گئی تھی۔ بعد میں بانو بھی مجھ سے ہِل گئی۔ اور پھر صحیح معنوں میں میری دوست بن گئی۔"

"مجھے اب تک یاد ہے کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب باقاعدہ تیار ہو کر مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے آئے تھے۔ میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ وہ بہت مشہور آدمی ہیں، لیکن میں نے جلد ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ اس سارے منظر کو میں اب بھی دیکھ سکتی ہوں۔ اس منظر کی یاد میری آنکھوں میں اس طرح موجود ہے جیسے کوئی بڑی سی روغنی تصویر۔"

"ڈاکٹر صاحب شلوار قمیص پہنے ہوئے صوفے پر بیٹھے تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ یہ لباس انھوں نے میرے اعزاز میں پہنا ہے۔ ورنہ وہ عام طور پر گرمی کے موسم میں تہمد اور بنیان پہن کر گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے بڑی اپنائیت کے ساتھ مجھ سے بات کی۔ ان کے دوستانہ سلوک کی وجہ سے میں فوراً ہی ان کی گرویدہ ہو گئی کہ انھوں نے اپنی شہرت کو اپنے اُوپر مسلّط نہیں کیا۔

"وہ صبح کے وقت اکثر مجھے بلا لیتے تھے کہ ان کے انگریزی خطوط پڑھ دوں۔ بعض دفعہ میں ان کے جواب بھی لکھتی تھی۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔"

"میری ایک عادت یہ ہے کہ میں جو سوچتی ہوں وہ کھل کر کہہ دیتی ہوں۔ کچھ نوجوانوں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا تھا تقسیم کے مسئلے پر۔ وہ خط پڑھ کر میں نے ڈاکٹر صاحب پر اپنے خیالات ظاہر کر دیے۔ میں نے ان سے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ لوگ اکٹھے ہو کر رہیں۔ وہ مسکرانے لگے اور پھر اپنا نقطۂ نظر مجھے بتایا۔ وہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ میں کھل کر گفتگو کروں۔"

میں نے پوچھا کہ کبھی اس قسم کی گفتگوؤں میں شعر و سخن کا ذکر بھی آیا۔ نہیں، شاعری کا کبھی نہیں ذکر آیا۔ میں نے تھوڑی سی اردو تو سیکھ لی تھی۔ اس لیے کہ نوکروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی شاعری کی HIGH FLOWN اردو میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شاعر کی حیثیت سے نہیں جانتی تھی میں ڈاکٹر صاحب کو۔ میں تو انھیں دلِ دردمند رکھنے والے ایک آدمی کے طور پر جانتی تھی۔ وہ بہت عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔

وہ جاوید منزل کے معمولات کا ذکر اس انہماک کے ساتھ کر رہی ہیں جیسے یہ اب بھی ان کی تسبیحِ روز و شب ہے۔

"رات کے کھانے کے بعد بچے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوتے۔ میں کرسی پر بیٹھ جاتی اور بالو سارے میں کودتی پھاندتی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھتے کہ تم تھک تو نہیں گئیں؟ اکثر وہ ان کے بستر پر سو جاتی اور میں اسے اٹھا کر اس کے بستر تک لاتی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے۔"

"اس زمانے میں ان کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ ان کو بھوک نہیں لگتی تھی۔ میں زبردستی انھیں شام کے وقت تھوڑا سا سوپ پلا دیتی۔ ڈاکٹر صاحب کو ابھی اور زندہ رہنا چاہیے تھا، یہ ان کے خاندان کے لیے اچھا رہتا اور ان کے ملک کے لیے بھی۔"

ڈورس احمد نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے تو اب یہ داستان ہو جائے گا۔ اسے روکنا اب ان کے بس میں نہیں۔ شاید وہ یہ بھی بھول گئی ہیں کہ وہ یہ باتیں کسی کو سنا رہی ہیں یا اپنے ہی آپ دہرا رہی ہیں۔ پھر کوئی بات یاد آتی ہے اور وہ ہنستی ہیں۔ جاوید منزل میں ایک نوکر تھا رحما۔ وہ باغ کا کام کرتا تھا۔ اسے بچوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ایک دن ہم لان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا تخت باہر ہی بچھوا لیا تھا۔ میں ان کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ رحما آیا اور مجھ سے کچھ پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتا دیا۔ رحما ملتان کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ بڑا سیدھا سادا آدمی تھا۔ وہ صرف اپنے علاقے کی بولی میں بات کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری اور اس کی گفتگو سن کر بہت ہنسے۔ کہنے لگے یہ جو کہتا ہے میں تو سمجھ بھی نہیں پاتا۔ آپ اس کی بات سن کر جواب بھی دے لیتی ہیں۔ وہ دیر تک ہنستے رہے۔ اس وقت وہ بہت محظوظ ہوئے تھے۔

"اصل میں لوگ جو باتیں کرتے تھے وہ میں سمجھ لیتی تھی۔ عام بول چال میری سمجھ میں آجاتی تھی۔ مجھے بیگم رشید احمد صدیقی کا ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ میرے لیے بہن کی طرح تھیں۔ وہ بہت خوبصورت اردو بولتی تھیں۔ اردو میں

شُدبُد مجھے ان ہی سے حاصل ہوئی۔

جاوید منزل میں آنے والے اشخاص بھی انھیں یاد آتے ہیں۔" اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی بی کو میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ہم انھیں "پھپھی" کہتے تھے۔ اپنے تمام بہن بھائیوں میں اقبال ان سے ہی زیادہ قریب تھے۔ وہ ان کی کتابیں پڑھنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔ وہ ہم سے ملنے کے لیے آتی تھیں اور کئی دن تک ٹھہری رہتیں۔ جب کہ دوسری بہن ذرا مختلف مزاج کی خاتون تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے آخری دنوں میں وہ کوئی تعویذ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے انھیں روکا تو ان سے میری بدمزگی ہوگئی۔"

خانوادۂ اقبال کے مختلف لوگوں کے بارے میں ڈورس احمد کے تاثرات بہت واضح اور دوٹوک ہیں۔ جاوید منزل کے معمولات سے متعلق ان کی یادوں میں چھوٹے بڑے ایسے بہت سے واقعات محفوظ ہیں جن سے ان تمام لوگوں کے عادات اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا ذکر بھی وہ بڑے دل چسپ انداز سے کرتی ہیں۔ پھر یکایک انھیں یاد آتا ہے کہ وہ گھر کی بھیدی ہیں۔ اس لیے وہ محتاط ہو جاتی ہیں۔ ان کی اس احتیاط پسندی سے دورانِ گفتگو میرا کئی بار واسطہ پڑا۔ اقبال اور خانوادۂ اقبال کے بارے میں وہ پہروں گفتگو کر سکتی ہیں۔ اور باتیں کرتے کرتے ان کا جی نہیں بھرتا۔ تاہم جب میں نے ان سے کہا کہ میں ان کا باقاعدہ انٹرویو کرنا چاہتا ہوں اور اگلی مرتبہ باتوں کو ریکارڈ کروں گا تو انھیں چپ سی لگ گئی۔

"انٹرویو میں نہیں دینا چاہتی۔ انٹرویو کے نام پر لوگ آتے ہیں اور جانے کیا کیا الٹے سیدھے سوال پوچھتے ہیں۔ مجھے کئی بار اس کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے لکھ ڈالا ہے۔ جاوید مجھ سے کئی برس سے اصرار کر رہا تھا۔ ناصرہ (بیگم جاوید اقبال) نے میری مدد بھی کی لیکن میں اس کتاب کو لکھتے ہوئے ساری باتوں کی تحقیق نہیں کر سکی۔ اس لیے اس میں ایک آدھ چھوٹی سی غلطی بھی ہے۔"

خانوادۂ اقبال کے باہر کے کسی فرد کو غالباً اقبال کی نجی زندگی کے بارے میں اتنی واقفیت نہیں ہوگی جتنی کہ ڈورس احمد کو ہے۔ لیکن اس بارے میں لوگوں کے حد سے بڑھے ہوئے تجسس پر وہ ناخوش ہیں۔ اسی لیے وہ یہ بھی نہیں چاہتی ہیں کہ وہ اس ضمن میں کسی قسم کی قیاس آرائی کا سبب بنیں۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی پس منظر ہی میں رکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے نام میں یہ 'احمد' کیسے آیا تو انھوں نے بس ایک جملہ کہا کہ میری شادی ہوئی تھی۔ پھر میرے شوہر نہیں رہے۔ اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ مجھے بھی مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس سوال کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔

اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے انھیں تامل ہے لیکن اپنے تجربات وہ خوب مزے میں بتاتی ہیں۔ برلن کے بارے میں تو مجھے سوال پوچھنا ہی تھا کہ اس شہر میں رہنا کیسا لگتا ہے۔ "میں ۱۹۳۲ء میں برلن کو چھوڑ گئی تھی۔ میں اس شہر کے قریب کے ایک علاقے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور بہت چھوٹی تھی جب یہاں آئی تھی۔ یہ میرے لیے میرا پہلا شہر ہے۔ لیکن مجھے لاہور بہت یاد آتا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو میں پاکستانی ہوں۔ میری زندگی کا بڑا حصہ تو وہاں گزرا۔ جب برلن سے گئی تھی تو یہ اور طرح کا شہر تھا۔ اب واپس آتی ہوں تو دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ ایک ملک کے دو ہو گئے۔ میرے لیے یہ سب بہت تکلیف دہ ہے۔

"ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بعد بھی ان کے بچّوں کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ آپ کو تو پتا ہے کہ جن بچّوں کے ماں باپ نہیں ہوتے ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میں تو اس وقت تک وہاں رہی جب تک کہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں آباد نہیں ہو گئے۔ پھر میرے بھائی کا خط آیا کہ اب تم واپس کیوں نہیں آجاتی ہو۔ میں نے سوچا کہ میں نے بہت کر لیا۔ اب مجھے واپس آجانا چاہیے تو میں ۱۹۶۲ء میں لاہور سے چلی آئی۔ اور واپس آئی تو دیکھا کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ یہ مشرق اور مغرب، دو ملکوں کا سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا جس پہ مجھے افسوس تھا۔ اس وقت میرے بھائی زندہ تھے۔ چند برس بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر یہ سانحہ اس سے پہلے پیش آتا، تو شاید میں واپس ہی نہ آتی۔"

"جاوید نے مجھے خط لکھا کہ جب سے آپ گئی ہیں، جاوید منزل میں وہ بات نہ رہی۔ جاوید منزل میں میری کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے لکھا کہ میرے خط کے بین السطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔ اس نے بڑا اصرار کیا کہ میں واپس آجاؤں، لیکن میں یہیں رہ پڑی۔"

"ظاہر ہے کہ جاوید منزل کی کمی مجھے بھی محسوس ہوتی ہے۔ پچھلی بار جب میں پاکستان آئی تھی تو اسے دیکھنے گئی تھی۔ اب تو اسے میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اس کا پچھلا حصّہ جس میں بالو کا اور میرا کمرہ تھا، وہ بند پڑا تھا لیکن یہ پھر بھی وہی جگہ تھی۔ مانوس اور محبوب۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں کتنا اچھا کام ہوا ہے۔ لیکن اب مجھے وہاں اجنبیت بھی محسوس ہونے لگی۔ اب اس کی حیثیت گھر کی نہیں رہی تھی۔ میوزیم گھر نہیں ہوتا۔"

وہ پاکستان کا سفر کر چکی ہیں اور اگلے سال پھر آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ جاوید اقبال کے علاوہ۔ یہاں ان کے کئی اور احباب بھی ہیں۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ وہ ڈاکٹر سلیم الزّماں صدّیقی کا ذکر کرتی ہیں۔ صدّیقی صاحب کی بیگم سے ان کی دوستی تھی۔ میں نے بتایا کہ جرمن زبان کے ابتدائی اسباق میں نے بیگم صدّیقی سے ہی لیے تھے۔ برلن کو وہ اکثر یاد کرتی تھیں۔ ان کا نوسٹلجیا، میرے اشتیاق کو مہمیز کرتا رہا اور آخر سفر کا بیش خیمہ بن گیا۔ لیکن ہر سفر کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے ــــ یادوں اور خوابوں میں۔

میں یہ ساری گفتگو دل چسپی کے ساتھ سنتا رہا۔ اچانک ڈورتھی احمد کو احساس ہوتا ہے کہ ساری باتیں تو وہ ہی کر رہی ہیں۔ "میں ہی بولے چلی جا رہی ہوں۔ جب کوئی لاہور یا اقبال کا نام لے دیتا ہے تو یہی ہوتا ہے۔ اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

میں نے ذکر کیا کہ چند دن بعد میں پیرس جانے والا ہوں تو ان کی آنکھوں میں چمک آگئی (عجیب شہر ہے یہ پیرس بھی کہ جو شخص اس کا نام سنتا ہے اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ جلد ہی میرا بھی یہی حال ہونے والا ہے کہ ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔)

سفر کا خیال انھیں پسند آیا ــ دنیا کو گھوم پھر کر دیکھنا چاہیے۔ جو لوگ گھر میں بند بیٹھے رہتے ہیں وہ تنگ نظر ہو جاتے ہیں۔ آج کی دنیا کو تنگ نظر لوگوں نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ سفر کرنے سے نظر میں وسعت اور دماغ میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی سفر کرتا ہے تو نت نئی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے بھی اپنے وقت میں ایسا کچھ دیکھا ہے۔

اقبال کو اتنے قریب سے دیکھ لینے کے بعد وہ اپنی زندگی کے بارے میں واقعی یہ کہہ سکتی ہیں۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ــــ تا دم از زندگیٔ خویش کنارے کردم

burshane
– the most trusted name in liquefied petroleum gas
Backed by international know-how and experience Burshane has served the nation for over 18 years by
- supplying a clean and economical indigenous bottled fuel in cylinders at the consumer's doorstep.
- developing a variety of specialised applications of Burshane gas in tobacco curing, poultry farming, fishing trawlers, hotels, restaurants, defence establishments, textile and various other industries
- saving precious foreign exchange
The Burshane name symbolises unmatched service, safety and technical expertise.
Remember
burshane
–the pioneers of bottled gas in Pakistan

پاکستانی بینکاری ...
ترقی پر گامزن ہے۔

پاکستانی بینک جدید پیشہ ورانہ خطوط پر عمل پیرا ہو کر بینکاری سے متعلق منفعت بخش خدمات کے نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔

سُبک رفتاری اور اعلیٰ کارکردگی

کام کی تیز رفتار اور پیشہ ورانہ اہلیت کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے پاکستانی بینکوں نے اپنے روزمرہ کے معمولات میں جو نمایاں ترقی کی ہے وہ روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے۔ کور بینکنگ سروس نظام کے باضابطہ استعمال کی بدولت مختلف شہروں کے درمیان دستاویزات کی منتقلی، اُن کے مابین چیکوں اور ڈرافٹس کی جلد ترین ادائیگی ممکن ہو گئی ہے۔

مرکزی اختیارات کی تقسیم

مرکزی اختیارات کی تفویض کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیشِ نظر عوام کے مقامی سطح کے مسائل جو پہلے صدر دفاتر میں حل کیے جاتے تھے اب مقامی طور پر حل کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پانچوں پاکستانی بینکوں نے اپنا ایک ایک ممبر ایگزیکٹو بورڈ ہر صوبائی صدر مقام میں مکمل اختیارات کے ساتھ تعینات کر دیا ہے۔

ترسیلِ زر کی تشکیلِ نو

بیرونِ پاکستان سے ترسیلِ زر (Remittances) کے طریق کار میں خاطر خواہ تبدیلی آ چکی ہے۔ پاکستانی بینکوں نے بیرونی ممالک میں اُن افراد کے لئے جو پاکستان میں اپنے زیرِ کفالت افراد کے لئے روپیہ بھیجتے ہیں اُن کی ضروریات کے مطابق نئے خصوصی انتظامات شروع کر دیے ہیں اور اس ضمن میں بہترین خدمات پیش کی ہیں۔

بھرتی اور تربیت کا جدید معیار

تمام بینکوں نے بھرتی کے معیار کو بلند کرنے کا طریق کار اختیار کیا ہے۔ مزید برآں متعلقہ عملے کو بینک کاری کی جدید پیشہ ورانہ خدمات کی تربیت دینے کے لئے خصوصی پروگرام شروع کیے ہیں۔

الیکٹرونکس اور کمپیوٹر کا استعمال

حساب کتاب کے طریقۂ کار کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے اور معاملاتی تجزیے کے لئے پاکستانی بینکوں میں اعداد و شمار کیلئے کمپیوٹر اور الیکٹرونک مشینوں کا استعمال بہتر سے بہتر کیا جا رہا ہے۔

زرعی سرمایہ کاری کے لئے بیش بہا سہولتیں

زرعی سرمایہ کاری سے متعلق تمام کاشتکاروں کو سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ بالکل بلا منافع قرضوں کی مد اب متعلقہ آسانیوں کے تحت ۱۲ ہزار روپے فی کس ہے۔

چھوٹی صنعتوں کے لئے بہتر سہولتیں

چھوٹی صنعتوں کو فراہم کی جانے والی سہولتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اور اب قرض کی سہولتوں میں مزید توسیع کرنے کے ساتھ، چھوٹی صنعتوں کے لئے آئی۔ ڈی۔ اے کے تحت بھاری قرضہ جات کی تقسیم میں بھی یہ بینک ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

پاکستانی بینکوں کے جملہ اقدامات کا مسلسل جائزہ لیا جاتا ہے جو اہلیت، درخدمات کے فروغ دینے، شکایات کا ازالہ کرنے، بھرتی کے معیار، عملے کی تربیت، قواعد و ضوابط کی پابندی، متعینہ طریقِ کار، وصولیابی کے فیصد اور ممکنہ مجموعی منافع کے لئے برتے کار لائے جاتے ہیں۔

پاکستانی بینک آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں

پاکستان بینکنگ کونسل

نیشنل بینک آف پاکستان | حبیب بینک لمیٹڈ | یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ | مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ | حبیب بینک آف پاکستان لمیٹڈ

PBC-1

NAB-87

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

شاہ تراب

نام تراب علی۔ تخلص تراب اور لقب گنج الاسرار تھا۔ شاہ تراب کے نام سے معروف تھے۔
سالِ پیدائش ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۷ء۔ سالِ وفات کا تعیّن ابھی تک نہیں کیا جا سکا ہے۔ ۱۱۸۷ھ تک زندہ تھے۔

شاہ تراب مدراس کے علاقے ترنامل کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور آکر پیر پاشاہ حسینی کے مُرید ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۱۵۰ھ میں مُرشد نے خلافت عطا کی اور انھیں کے حکم پر ترنامل واپس گئے اور وہیں اپنا تکیہ قائم کیا۔ جہاں سے تبلیغِ دین کے سلسلے میں کرناٹک کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔

شاہ تراب صاحبِ ارشاد صوفی تھے۔ ان کی شاعری میں بھی تصوّف اور معرفت کا بہت گہرا رنگ ہے۔ ان کے آبا و اجداد بھی صوفی بزرگ تھے جس کا اشارہ ان کے اشعار میں ملتا ہے۔

فارسی اور عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ مرہٹی اور دوسری علاقائی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ معرفت اور تصوّف کے علم کے ساتھ دیگر علوم سے بھی آگاہ تھے۔ رمل، حکمت، نجوم اور ہیئت اور فلسفہ سے واقف تھے۔ علم رمل میں انھیں اتنی دست گاہ تھی کہ مُرشد نے گنج الاسرار کا خطاب دیا۔

شاہ تراب کی شخصیت دل کش اور ان کی ذات با فیض تھی۔ وہ متوکل اور بے نیاز انسان تھے جس کا اندازہ ان کے کلام سے بھی ہوتا ہے۔ اپنے دور کی بدحالی، اخلاقی خرابیوں اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے گھبرا کر شاہ تراب نے گھر بار چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے جنگل کو بھی اپنا مسکن بنا لیا بعد میں کرناٹک اور بالا گھاٹ پر انگریزوں کے تسلّط کے بعد سیاسی صورتِ حال اور معاشرتی ابتری سے بد دل ہو کر اپنے بیٹے غلام مرتضیٰ علی کو خلافت سونپ کر گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔

شاہ تراب کثیر التصانیف شاعر تھے۔ ان کی تخلیقات میں سب سے اہم ان کا دیوان ہے جس میں پانچ سو اکھتّر (۵۷۱) غزلوں کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن بھی موجود ہیں۔ دیوان کے علاوہ ان کی اہم تصنیفات ظہور کلی

من سمجھاون، گلزارِ وحدت، گنج الاسرار، قصّۂ مہ جبین و ملّا، گیان سروپ، آئینۂ کثرت، اور ایک طویل مثنوی 'رام چندر و دلآرام' ہیں۔

شاہ تراب کے دیوان کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کی ملکیت ہے۔

یہ انتخاب "دیوان تراب" مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، مطبوعہ ۱۹۸۲ء (انجمن ترقی اردو پاکستان) سے کیا گیا۔

انتخابِ کلام

جو ہے دیوانہ سجن کی چال کا   نئیں خبر کچھ اس کوں اپنے حال کا
نہیں کچھ کو
روز و شب پھرتا ہے عاشق در بدر   پوچھتا احوال دلبر لال کا

گلِ خورشید ہے گویا شگفتہ   سجن تجہ سر اوپر چیرہ زری کا
تیرے دستار
کیا دل چشم کی گردش سوں گرداں   کہاں سیکھا ہنر جادوگری کا
سے

جب سوں دیکھا ہوں کھلا کاکلِ مشکیں دھن کا   تب سوں پھرتا ہوں بھنور ہو کے پریشاں من کا
سے محبوبہ سے
بے دھڑک ہو کے رقیباں سوں نہ کرنا وسواس   سیکھ میرے سوں ہنر آ کے برہ کے فن کا

عشقِ بتاں اے زاہد از بس ثواب ہے گا   یہ زہد خشک تیرا سارا حجاب ہے گا
اے دل کبھی نہ کر توں کچھ اعتبار اس کا   جو کر و فرِ دنیا جیوں نقش آب ہے گا
تو
کرتا نہیں بھروسہ او آج ہور کل کا   جو رند لاابالی یا بر رکاب ہے گا
وہ اور

آخر فنا ہے جینا دھن مال کیا کرے گا   یو حرص ہور ہوا سب جنجال کیا کرے گا
عورت یہ اور

جسے عشقِ صنم درکار ہے گا　　اسے رسوائی کا کیا عار ہے گا

نہ رکھتا کفر ہور اسلام سوں کام　　جو کوئی صاحبِ اسرار ہے گا
اور　سے

او ہے ساقیٔ بزمِ خوب رویاں　　مئے وحدت سے جو سرشار ہے گا
وہ

گل بدن گلشن منے جس وقت خنداں ہوئے گا　　گل گریباں چاک ہو رسوائے دوکاں ہوئے گا
میں

رفتہ رفتہ دل مرا داغوں کی گل کاری ستی　　گل رُخاں کی سیر کوں صحنِ گلستاں ہوئے گا
سے　کو

ان سیہ چشماں سوں سودا مت کرو اے مردماں　　نفع تو معلوم، نقدِ جاں کا نقصاں ہوئے گا
سے

آہوئے دل یک بیک ہو نیم بسمل گر پڑا　　یا نگہ کی ہول ہے یا تیرِ مژگاں ہوئے گا

دکھاوے اگر یک جھلک گل بدن　　لیوے چھین کر حُسن گلزار کا

جسے کفر و اسلام یکساں ہوا　　نہ سبحہ نہ حاجت ہے زُنّار کا

دلا ورد کر جگ میں اس نام کا　　جو معشوق ہے خاص ہور عام کا
اور

کہا چیرے پہ رنگِ زعفرانی کس نے چھڑکا ہے　　کہا معلوم نئیں تجھ کوں جو پچکاری سے توں چھڑکا
دستار　نہیں تجھ کو　تونے

اُوس بت کے واسطے میں برہمن کلاؤں گا　　زُنّار گل میں باند کے ٹیکا لگاؤں گا
اُس　کہلاؤں　گلے　باندھ

مسجد کے صحن بیچ موذّن کی سُن اذاں　　ناقوسِ آہ دیرِ صنم میں بجاؤں گا

زاہد! تجھے تو فکرِ رکوع و سجود ہے — میں جام لے کے گردنِ مینا نواؤں گا
جھکاؤں گا

کھُل رہے ہیں پیچ اس کی لٹ پٹی دستار کے — یا گلے میں ہار ہے یا چاند کوں ہالا ہوا
کو

بانس کی لے بانسلی تر بھنگی چھب سوں ہے کھڑا — اے میرے بانکے کنیّا بول کب سوں ہے کھڑا
بانسری ترجھی سے کنھّا سے

کیوں نہ رہے جہاں میں منوّر مرا سخن — او شمع رونے مشعلِ محفل مجھے کیا

جاناں نے چشمِ مست کا کاجل مجھے کیا — رکھنے کوں روبرو تو سجنجل مجھے کیا
کو آئینہ

ذرّہ ہوں تجہ جمال کا اے آفتاب آ — مشتاق جیوں چکور ہوں اے ماہتاب آ
تجھ جیسے

مینائے دل میں طاقتِ سنگِ فراق نئیں — بے تاب ہو رہا ہوں پری رُو شتاب آ
نہیں

جب لگ کہ ہوں خموش تبھی لگ ہے خیریت — افشا کروں گا راز خدا واسطے نہ چھیڑ
تگ تگ

شرابِ عشق سوں مخمور ہیں ہم — صلوٰۃ و صوم سے معذور ہیں ہم

بحمداللہ کہ ہور سوائے عالم — فنونِ عشق میں مشہور ہیں ہم

عالمِ آزادگی میں پادشاہِ وقت ہوں — بوریائے بے ریا پر تاجدارِ تخت ہوں

شکرِ خدا کہ جگ منے بے شک تراب ہوں — جس نام کے طفیل سوں صاحب کتاب ہوں
میں سے

احوال میرا شمع شبستاں سیتی پوچھو — جل آتشِ ہجرت منے پروانہ ہوا ہوں
سے

اے بادہ کشاں میری خرابی کوں نہ پوچھو — رسوائے جہاں ساکنِ میخانہ ہوا ہوں
کو

فنونِ عشق میں اے دل سراپا　　نہایت صاحبِ تدبیر ہوں میں

دل پریشاں ہو تڑپتا ہے مرا　　تم جو بیٹھے کھول کا کُل جی میاں

محراب میں بھنواں کے عبادت ہے فرضِ عین　　زاہد توں پوچھ جا کے کسی پا کبازسیں
تو　　سے

از صبح تا بہ شام مجھے ہے خیالِ یار　　مت کام رکھ تو زاہدا میری نمازسیں

ٹوٹ پڑتیاں ہیں مثلِ پروانہ　　شمع رُو کے اُوپر شتاب انکھیاں
پڑتی

مت اپنے کھبا ئے توں کھُلے بال کوں دیکھو　　آ میری پریشانیٔ احوال کوں دیکھو
خدار　تو　کو　　کو

مانند کتاں چاک ہے دل اپنے گنہ پر　　اے ماہِ جبیں مت مرے اعمال کوں دیکھو
　　کو

دلربا ٹک سخن تو سُن جاؤ　　ہم طرف بھی کبھو کبھو آؤ

خانۂ عاشقاں ہو ویں روشن　　او مبارک قدم یدھر لاؤ
　　اِدھر

منتظر ہوں صنم بہت دن سوں　　یارے اک دن تو شکل دکھلاؤ
سے

ادا ہور ناز غمزے سوں دکھا ابرو کماں جاناں　　دلِ عشّاق کرتے ہیں شکار آہستہ آہستہ
اور

بہارِ تو جوانی کا نہ کر تو اعتبار ہرگز　　ہر اک گلشن میں جاتا ہے بہار آہستہ آہستہ

آ صنم دل کوں بے قراری ہے　　تجہ سوں ملنے کی انتظاری ہے
کو　　تجھ سے

مت قدم ڈال اس جگے ہرگز　　جس جگے اپنی بے وفاری ہے
جگہ　　جگہ

بھرا دیں گے ترا دل میکدے سیں   دِلا مت بیٹھ صحبت فاضلوں کی
سے

ہم سوں کچھ تقصیر تو ایسی نہیں صادر ہوئی   تم کوں گر کچھ یاد ہے تو صاف بولو کیا ہے جی
سے کچھ   کو کچھ

جس طرف دیکھے تو دستا ہے اوہی دو جا نئیں   گر اوہی ہے ذاتِ باری بس من و تو کیا ہے جی
نظر آتا ہے وہ   وہ

یوں کبھو حادثۂ چرخ نہ گزرا مجھ پر   پوچھو گے کب تو کہوں گا کہ میاں اب گزری
کبھی   مجھ

جس کوں دھن کا وصال پیارا ہے   اس کا طرزِ خیال پیارا ہے
عورت

جو ہے تیرے جمال کا عاشق   اس کوں تیرا جلال پیارا ہے

سراپا کیفیت سب سُن کے بولا پھر مفصّل کہہ   ترے آگے مرا احوال گو یا قصّہ خوانی ہے

تم ہر وضع سوں قول اپیں کا وفا کیجے   طورِ وفا کوں ناز و ادا سوں ادا کیجے
آپس   کو   سے

جس مرض کے علاج کوں عاجز طبیب ہے   یک نسخۂ نگاہِ کرم ہم سے دوا کیجے
کو

حشر کا کچھ نہیں وسواس مرے دل کوں امیر   اسد اللہ بھی ہے احمدِ مختار بھی ہے

مومناں دیکھ کے کہتے ہیں مجھے سارے پکار   عاشقِ پاک بھی ہے صاحبِ اسرار بھی ہے

توصیف میں قاصر ہے زباں بس کہ سراپا   یا شاہ مرے پر جو ترا افضل و کرم ہے

ارے دل کیا سبب ناحق پریشاں اس قدر ہے رے   کسی کے حلقۂ کاکُل کا شاید کچھ اثر ہے رے
ارے دل ہم تراب نقشِ پا ہیں خوب رویاں کے   زیادہ گفتگو پھر کیا ہے قصّہ مختصر ہے رے

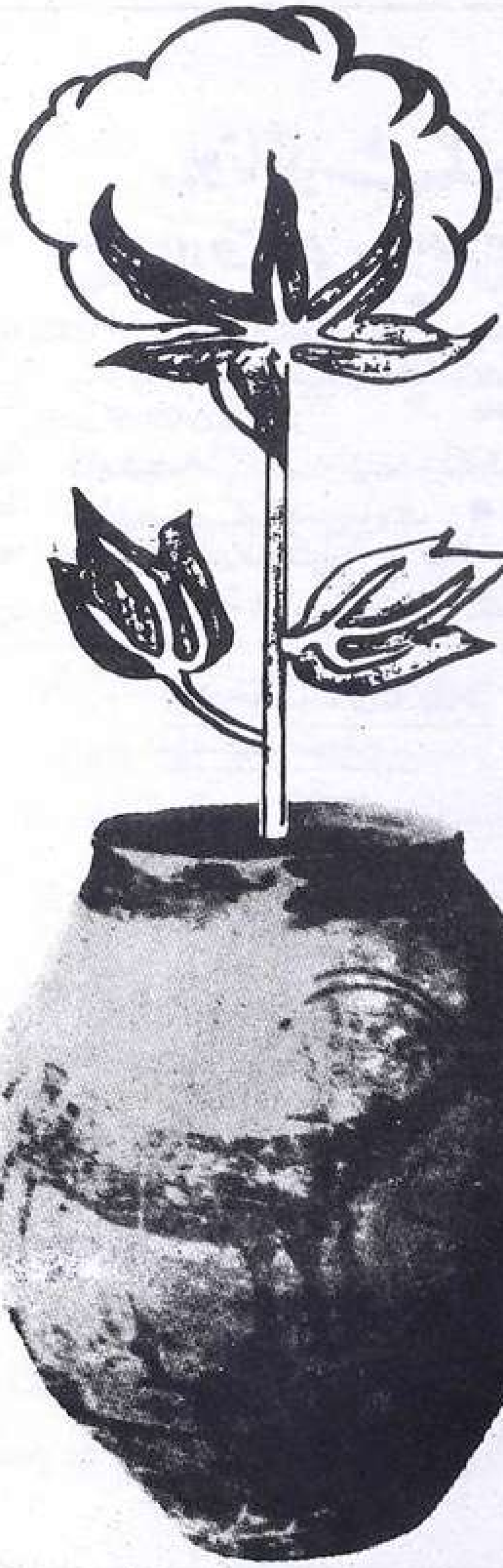

تہذیب کا چمن زار اِس پھول کی دین ہے

کپاس کے پھول سے حاصل ہونیوالی روئی کے پارچے کی صنعت انسانی تہذیب کے اوّلین کارناموں میں ہے، دریائے سندھ کی وادی میں پائے جانے والے ۵ ہزار سال قبل کے آثار اس کے شاہد ہیں۔

آج بھی روئی کو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کی علامت کہا جاسکتا ہے۔ جس پر ہماری سب سے بڑی صنعت اور ہر جہتی ترقی کا دارومدار ہے۔ ملک کی بہت بڑی آبادی کی معاش، روئی کی کاشت، کاروبار اور متعلقہ صنعت پر انحصار رکھتی ہے۔

کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان اس بات کیلئے کوشاں ہے کہ ہماری یہ سب سے بڑی تجارتی فصل برابر ترقی کرتی رہے اور ملک کے لیے مزید نفع بخش ثابت ہو۔

PAKISTAN

کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر ۳ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ
پوسٹ بکس ۳۷۳۸ کراچی پاکستان۔ کیبل ایکسکوٹکو
ٹیلیکس ۲۶۲۸ - ایکس کوٹ پی کے - ۲۴۶۹۳ - ایکس کوٹ پی کے
فون: ۵۹-۵۶-۵۱۶۰

ہڑپا سے برآمد ہونے والا ایک منقش مٹکا

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

بین الاقوامی بینکاری میں پیش پیش

پاکستان اور دُنیا بھر کے گوشے گوشے میں موجود ۱۶۰۰ سے زائد شاخوں اور دفاتر کے ذریعے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ درج ذیل شعبوں میں بینکاری کی مکمل خدمات پیش کرنے میں ہمہ وقت کوشاں ہے۔

- درآمدات اور برآمدات کیلئے سرمائے کی فراہمی
- غیر ملکی کرنسی میں قرضہ جات
- آئی ڈی اے کے قرضہ جات
- چھوٹے قرضہ جات
- زرعی قرضہ جات
- غیر ملکی اور ملکی ضمانتیں
- ترسیلاتِ زر اور ماہرانہ مشاورتی خدمات

ہماری خدمات سے متعلق مزید معلومات کے لئے ہمارے بینک کی قریب ترین شاخ سے رجوع کریں۔

بیرونِ ملک شاخیں / دفاتر

ریاستہائے متحدہ امریکہ
نیویارک

برطانیہ
لندن
- منگ لین
- کمرشیل اسٹریٹ
- کنگسٹن
- ہانسلو

بریڈفورڈ
مانچسٹر
لیڈز
اولڈہام، لنکشائر
برمنگھم
گلاسگو

بحرین
منامہ
باب البحرین
محرق

ذیلی و مشترکہ کاروبار
سلطنت عمان
کمرشل بینک آف عمان لمیٹڈ
سعودی عرب
یونائیٹڈ سعودی کمرشیل بینک
سوئٹزرلینڈ
یونائیٹڈ بینک اے۔جی زیورخ

قطر
دوہا

متحدہ عرب امارات
ابوظہبی
- مین برانچ
- ایئرپورٹ روڈ
- شیخ ہمدان روڈ
- العین

دُبئی
- ڈیرہ دُبئی
- ڈیرہ مین برانچ
- داور المصلیٰ

شارجہ
- شارجہ

عرب جمہوریہ یمن
صنعاء

مصر
قاہرہ

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
آپ کی خدمت کے لئے کوشاں

manhattan PAKISTAN

سلیم الدّین قریشی

سرسیّد کا ایک غیر مطبوعہ خط

(ہم انڈیا آفس لائبریری کے جناب سلیم الدین قریشی کے ممنون ہیں کہ وہ گاہے گاہے "قومی زبان" کو نوادر سے نوازتے رہتے ہیں)

انڈیا آفس لائبریری، لندن کے شعبۂ مغربی مخطوطات میں سرسیّد کے لکھے ہوئے جو خطوط موجود ہیں ان میں سے ایک کا اردو ترجمہ "قومی زبان" کے دسمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

اسی سلسلے کے دو مزید خطوط حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ سرسیّد نے یہ دونوں خطوط اپنے ایک انگریز دوست سر رچرڈ اسٹراچی ۱۸۱۷ء–۱۹۰۸ء (SIR RICHARD STRACHY) کو لکھے تھے۔ اسٹراچی اس وقت انڈین فینانس کمیشن کے چیئرمین اور اپنے بھائی سر جان اسٹراچی کی غیر موجودگی میں وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے۔

اس خط میں سرسیّد نے اپنے لڑکے سیّد محمود کے لیے لکھنؤ یا الہ آباد ہائی کورٹ کی جج شپ کی سفارش کے لیے لکھا ہے۔ اس خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ لارڈ لارنس کے دور میں خود سرسیّد کو اس عہدہ کی پیش کش کی گئی تھی۔

سیّد محمود کا الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرّر بھی غالباً اسی خط کا نتیجہ تھا۔ لیکن ۱۸۹۲ء میں جب سرسیّد نے ایک خالص اسلامی تنظیم محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا قائم کر کے حکومت کی دشمنی مول لی تو سیّد محمود کو بھی اس عہدہ سے ہاتھ دھونے پڑے۔

علی گڑھ

یکم جون ۱۸۷۸ء

بیں کچھ عرصہ سے آپ کو ایک ایسے موضوع پر خط لکھنے کا متمنی تھا جس کے متعلق آپ کو زحمت دینے کی ہمّت نہ کرتا ہمّت نہ کرتا لیکن آپ کے ان احسانات کو جو آپ نے مجھ پر اور میری اولاد پر کیے ہیں، مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ خط لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

میرا لڑکا سیّد محمود جیسے آپ سے ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے، پچھلے چند سالوں سے ہائی کورٹ اور صوبوں کی مختلف عدالتوں میں بیرسٹر کی حیثیت سے وکالت کر رہا ہے اور اپنے لیے ایک اچھی خاصی پریکٹس قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے ہائی کورٹ کے حکام بھی اس کی کافی قدر کرتے ہیں۔

اسے اپنے پیشے کے علمی کاموں سے بے حد دل چسپی ہے لیکن ان صوبوں میں بیرسٹر کو کچھ ایسے مسائل سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن سے سیّد محمود کو کچھ زیادہ دل چسپی نہیں۔ اٹارنی کی غیر موجودگی میں اسے ایسے اشخاص سے بھی ملنا جلنا پڑتا ہے جن سے عام حالات میں وہ ربط و ضبط رکھنا گوارا نہ کرے۔

اس کے علاوہ اس پیشے کا سب سے منافع بخش پہلو وہ ہے جس میں بیرسٹر کو مفصل عدالتوں میں مقدموں کی پیروی کرنا ہوتی ہے۔ لیکن اس کام کے لیے اسے سفر میں کافی وقت ضائع کرنا پڑتا ہے اور علمی اور ادبی کاموں کی طرف خواہ وہ قانون سے متعلق ہوں یا کسی دوسرے ایسے موضوع سے تعلق رکھتے ہوں جن سے سیّد محمود کو اپنی انگریزی تعلیم کی وجہ سے دل چسپی ہے زیادہ توجہ نہیں دے سکتا۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ کچھ عرصہ سے اپنی ملازمت کی تبدیلی کے لیے بے چین ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اسے حیدرآباد میں اپنے پیشے سے متعلق معقول تنخواہ کے ایک عہدہ کی پیش کش ہوئی تھی۔ اس نے اس پیش کش کے ردّ و قبول کا حتمی فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ نہ تو میں خود اور نہ ہی میرے کنبہ کا کوئی فرد حکومتِ ہند کے علاوہ کبھی بھی کسی دیسی ریاست کی ملازمت قبول کرے۔ اس بنا پر میں نے سیّد محمود کو خواہ اسے برٹش گورنمنٹ کی کوئی مناسب ملازمت ملے یا نہ ملے نظام کی ملازمت قبول کرنے سے منع کر دیا۔

اس سلسلے میں اس نے قائم مقام چیف جسٹس ٹرنر TURNER سے بھی مشورہ کیا تھا۔ انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ جسٹس ٹرنر نے مزید کہا کہ ان کی اطلاع کے مطابق حکومتِ ہند سیّد محمود کا تقرّر عدالت کے ہر اس عہدے پر جس پر کسی ہندوستانی کا تقرّر کیا جا سکتا ہے کوئی تعرّض نہ کرے گی۔

فی الحال عدالتوں کے وہ تمام عہدے جن پر کسی ہندوستانی کا تقرّر کیا جا سکتا ہے، ایسے نہیں کہ سیّد محمود بیرسٹری کی نفع بخش پریکٹس کو چھوڑ کر ان میں دل چسپی لیں۔ لیکن شمالی ہند میں ایک یا دو عہدے ایسے ہیں جن پر میری اطلاع کے مطابق (ہندوستانیوں اور انگریزوں) دونوں میں سے کسی ایک کا تقرّر ہو سکتا ہے لیکن ان میں سے کسی پر ابھی تک کسی ہندوستانی کا تقرّر عمل میں نہیں آیا ہے۔ لکھنؤ کی سول جج شپ ان میں سے ایک ہے۔ سول عدالت کا کام سیّد محمود کی طبیعت کے مطابق ہے اور انھیں اس عہدہ کی ذمہ داریاں بھی پسند ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ لارڈ لارنس LAWRENCE کے دور میں آپ نے مجھے اس عہدہ کی پیش کش کی تھی۔ اور اس عہدہ پر اب جو شخص متعیّن ہے اس کا تعلق حکومتِ ہند کی باقاعدہ اور مستقل ملازمت سے نہیں ہے۔ اسی طرح الٰہ آباد کے چھوٹے مقدموں (SMALL CAUSES) کی عدالت کی جج شپ اس سے بھی بہتر ملازمت ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ حکومتِ ہند بنگال میں ڈسٹرکٹ افیلیٹ بنچز DISTRICT AFFILIATE BENCHES قائم کرنے والی ہے۔ ہر بنچ پر دو جج مقرّر

کیسے جائیں گے۔ ان میں سے ایک ہندوستانی ہو گا۔

ماضی میں مسٹر ٹرنر کو سید محمود کی پیشہ ورانہ قابلیت کے متعلق رائے قائم کرنے کے مواقع رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ سید محمود کو مذکورہ بالا عہدوں میں سے کسی بھی ایک عہدہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا اہل سمجھتے ہیں۔

مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ان عہدوں کے تقرر کی نامزدگی کے لیے حکومتِ ہند کس درجہ تک ذمہ دار ہے۔ لیکن اگر آپ لارڈ لٹن سے اس بات کا ذکر کر دیں تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

سید محمود چوں کہ پہلے سے ایک پیشے میں کام کر رہے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ حکومتِ ہند کو یہ معلوم نہ ہو کہ جوڈیشیل ملازمت ان کو قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔

اگر آپ میری یہ گزارش نامناسب نہ سمجھتے ہوں تو آپ کے سید محمود کی سفارش میں کہے ہوئے الفاظ آپ کے ان احسانات میں اضافہ کا سبب ہوں گے جو میں آپ سے حاصل کرتا رہا ہوں۔

آپ کی طبیعت کی ناسازی کے باوجود اس طویل خط کے ذریعے میں آپ کو جو زحمت دے رہا ہوں امید ہے آپ اس کا برا نہ مانیں گے

اگر آپ عالی جناب وائسرائے سے ملاقات کا مشورہ دیں تو میں، اور اگر ضروری ہوا تو سید محمود بھی شملہ جانے کے لیے تیار ہیں۔

امید ہے آپ کی صحت اب پہلے سے بہتر ہو گی۔ لیڈی اسٹراچی اور آپ کی خدمت میں بے حد آداب۔

آپ کا خادم
سید احمد

داستان زبانِ اردو (دوسرا ایڈیشن)

از: ڈاکٹر شوکت سبزواری

قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ — کراچی ۱

ڈاکٹر قاضی عبدالرحمان ہاشمی

سانحۂ کربلا بطور شعری اِستعارہ ۔ ایک مطالعہ

ہماری ادبی تاریخ کا کوئی بھی دور یگانۂ روزگار شخصیتوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ ہمارے عہد کی ادبی و تہذیبی روایت کی شناخت جن باکمال دانشوروں اور ادیبوں کے وسیلے سے ہوتی ہے، ان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام نہایت روشن اور تابناک ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کارنامہ محض اس قدر نہیں ہے کہ پڑھنا لکھنا ان کا وظیفۂ حیات ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی پوری زندگی اور وجود کو ایک قیمتی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر کے جس طرزِ عبادت کی بنا ڈالی ہے اس کی نظیر عہدِ حاضر میں اگر مفقود نہیں تو نایاب ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ پروفیسر نارنگ نے ذہنی پیوستگی اور خلوصِ نیت کے ساتھ زندگی اور اس کے لازمی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا یہ ہنر دانشِ مغرب سے حاصل کیا ہے جو ہمارے سہل الحصول طریقوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر نارنگ کے علمی و ادبی کارناموں کا دائرہ جس قدر وسیع اور متنوّع ہے اسی قدر اس کا پورا احاطہ کرنا خاصا دشوار ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے عہد کی بعض شخصیتیں جو باوجودیکہ ہم سب کے لیے نہایت محترم ہیں اور جن کے کارناموں کی وقعت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن ان کا تقابل پروفیسر نارنگ سے نہایت مشکل ہے۔ اس لیے کہ پورے ادبی منظرنامے پر ایک بھی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس کی دلچسپیوں کا دائرہ اتنا وسیع اور شوق اس قدر فراواں ہو جس کی مثال پروفیسر نارنگ کی شخصیت فراہم کرتی ہے۔ یہ دلچسپیاں محض برائے نام بھی نہیں ہیں۔ ہر کارنامہ چاہے اس کا تعلق اردو کے لسانی مباحث سے ہو، علمی تحقیق، شاعری یا فکشن کی تنقید و تفہیم سے ہو یا دیگر ادبی و تہذیبی مسائل و مشکلات سے ہو، پروفیسر نارنگ نے جس موضوع کو بھی نقطۂ ارتکاز بنایا ہے اس پر اپنی شخصیت اور خلوص کے گہرے نقوش مرتسم کر دیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر نارنگ کی خداداد عبقریت کا ایک مظہر "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ خود یہ مختصر سی کتاب بھی پروفیسر نارنگ کی ادبی و شعری کدوکاوش اور بصیرت کا ایک لازوال مرقّع اور اردو کی ادبی و تہذیبی روایت کا ایک فقید المثال اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں جس مسئلہ کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے وہ "سانحۂ کربلا" ہے جس کی ہم عصر اردو شاعری میں تخلیقی شمولیت ایک فعال اور متجسّس ذہن کے لیے متعدد سوال بھی پیدا کرتی ہے اور ان کے جواب بھی مہیّا کرتی ہے۔ سب سے اہم سوال خود "سانحۂ کربلا" ہے۔

—— ایک ایسا ہیبت ناک سوال ہے جو اپنی ایک صریح مذہبی نوعیت رکھتے ہوئے ماضی بعید کی یادگار ہونے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ یہ المیہ کسی خاص عہد، نسل اور خطۂ ارض سے تعلق رکھنے کے بجائے ہر عہد کی زندگی اور ہر انسانی وجود کے زنداں خانے میں جاری و ساری ازلی و ابدی رست خیز سے ایک قریبی اور گہری مماثلت رکھتا ہے۔ ہماری شاعری جس کی بنیاد بالعموم سیکولر رہی ہے اور ہم عصر شاعری جو "سانحۂ کربلا" کا نقطۂ حوالہ ہے۔ اس کے نئے ہونے کا جواز ہی یہی ہے کہ یہ شاعری ہر نوع کے مذہبی عقائد و نظریات کی بنیادوں کو مسمار کر کے انسانی وجود کے ملبے پر استوار کی گئی ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت کے کھنڈر سے برآمد ہونے والی یہ شاعری اپنے نجی و ذاتی تجربات کے خود مکتفی ہونے پر اصرار کرتی ہے، ہر نوع کی وابستگی اور رسمیات سے یک لخت دامن کش ہو کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہی شاعری "سانحۂ کربلا" کو جو اپنا ایک واضح مذہبی حوالہ رکھتا ہے، کیوں جا بجا ترسیلِ خیال کا ذریعہ بنانے سے دریغ نہیں کرتی۔ وہ کیا اسباب ہیں جن کے سبب ایک سیکولر روایت کی حامل شاعری کے لیے ایک بیّن مذہبی حوالہ رکھنے والے استعارہ سے اجتناب ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے کئی سوالات ہیں جن کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور ہونا چاہیے۔ "سانحۂ کربلا" سے مماثل اور بھی نہ معلوم کتنے ہی واقعات تو لرزہ خیز انسانی آلام ہو سکتے ہیں جو ہماری شعری روایت کا جزو بن سکتے ہیں اور بلاشبہ ہمارے تخلیقی شہ پاروں میں سانحۂ کربلا کے علاوہ بھی انسانی حافظے میں محفوظ بہت سے حادثات کی سرخیوں نے ہمیشہ ہی ہماری شعریات میں اثر و رسوخ کی راہیں تلاش کی ہیں لیکن اردو کی شعری روایت میں جس قدر حوالے اور اشارے سانحۂ کربلا کی مناسبت سے مستعمل ہوتے رہے ہیں اس کی مثال کوئی دوسرا عدیم النظیر واقعہ بھی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ ثنائی ادب کے ماسوا بھی ہماری شاعری نے کربلا کے معنی خیز تصوّرات سے بلا تامّل استفادہ کیا ہے۔ جدید تخلیقی میلانات جو مذہب اور مذہبی فکر سے ایک نوع کی بیزاری اور برگشتگی سے عبارت ہیں۔ ان میں بھی کربلا اپنی تمام تر آفاقی اور دائمی اقداری تسلسل کے ساتھ نقطۂ حوالہ بنتا رہا ہے اور یہ حوالے اس قدر حسبِ حال ہوتے ہیں کہ کسی سخت سے سخت ناقدِ شعر کے لیے بھی کبھی پریشانی کا سبب نہیں بنتے۔ اس کا سبب اس کے ماسوا کیا ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ اپنی لازمانی شان کے ساتھ ہر عہد کی درماندہ روح سے اپنا گہرا رشتہ استوار کر سکتا ہے، خصوصاً ہمارے عہد کے انسانوں کا اپنے ہی مقدّر کے الاؤ میں لمحہ بہ لمحہ سلگتا ہوا وجود خود اپنی ہی دانش کے ہاتھوں خاک و خون میں غلطاں زندگی، معرکۂ کربلا کی زیوں حالی اور کس مپرسی سے کچھ زیادہ ہی گہری ہم آہنگی اور مماثلت رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرتِ حسینؓ اور ان کی منتخب جماعت کے برگزیدہ نفوس کے حوالہ سے ہم جس المناک خونی ڈرامہ کے تماشائی ہوتے ہیں وہ رزمیہ تمام تر چند اشخاص تک محدود رہتا ہے جس کی ایک ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور جو ایک خاص تاریخی محور پر گردش کرتا ہے جب کہ ہمارے عہد کی زندگی جن آباد خرابوں کا مسکن ہے وہاں محض کچھ اشخاص اور کچھ افراد مبتلائے عذاب نہیں ہیں، یہاں ہر شخص جرمِ بے گناہی کی سزا بھگتنے پر مجبور ہے۔ یہ ایسا درد ہے جو لفظوں میں بھی ڈھلنے سے قاصر ہے، یہ ایسی خلش ہے جو کسی بھی پیرایۂ اظہار کی تاب نہیں لا سکتی۔

معرکۂ کربلا جو محض ایک خون خرابہ نہیں ہے جو محض دو حریفوں کی پنجہ آزمائی بھی نہیں ہے، جو محض کوئی اتفاقی حادثہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک عدیم النظیر شہادتِ حق، سیاہ راتوں میں انسانی قافلہ کی آخری شمع کو گُل کر دینے کی مذموم سعی، نقشِ خرد

اور شرفِ خودی کو پیوندِ زمین کر دینے کی جسارت، مستقبل کے مرئی اور غیر مرئی خوابوں کی پامالی، خوشیوں کے باغ میں آتشیں بگولوں کے نشیمن تعمیر کرنے کا طاغوتی منصوبہ وغیرہ سانحۂ کربلا کے ایسے تمام مضمرات اور علائم ہیں جن کے توسط سے ہمارے عہد کے شاعرانہ تخیّل کو ایک بہتر زبان اور پیرایۂ اظہار مل جاتا ہے۔

تخلیقی سطح پر کربلا ہر عہد کی دانش وری اور عبقریت کا بنیادی مرکزِ ثقل رہا ہے اور اس المیے کی لازمانیت نے ہر دور کی مظلوم زندگی کو ایک منشور اور نصب العین بھی عطا کیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ شاعرانہ تخیل و تصوّر میں تحلیل ہونے والی ان ریزہ ریزہ نورانی شعاعوں کو گرفتار کرنے کا عمل خود کس قدر جان لیوا ہے۔ اس کا شعور بہت اور اک وہی شخص کر سکتا ہے جو خود کو شعلۂ نفس کی آگ میں جلنے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ جو اس خارزارِ الم سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی سرتاسر ایک موجِ دریا کے مماثل ہے جو اپنے اندر غیر معمولی تڑپ اور بے قراری رکھتی ہے، یہ زندگی اپنی مبارزت طلبی کے صلے میں ہماری ادبی تنقید کو ایسے بیش قیمت صدف پارے دے جاتی ہے جن کی تب و تاب کو زوال کا اندیشہ نہیں۔ اس کی پرکھ وہی کر سکتا ہے جو خذف ریزے اور الماس کے فرق میں امتیاز کر سکتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے تخلیقی کاوشوں میں بکھرے ہوئے خاص استعاراتی پیکروں اور معنوی اشاروں کو مطالعہ کا موضوع بنا کر نہ صرف "سانحۂ کربلا" کی معنویت کو ہم عصر شاعری میں دریافت کیا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ ہماری کھوئی ہوئی میراث کو کھوج کر دوبارہ ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ میری مراد اس شعری کردار سے ہے جو خود ہماری ہی اپنی ذات کا ایک حصّہ ہے جو ہم سے بچھڑ چکا تھا جو حسینؑ کی مانند ہجومِ بلا میں ہمیشہ تنہا رہا ہے۔ جس کا جسدِ خاکی سرتاپا لہو میں غلطاں ہے اور جو اس سنگ لیستہ جہاں میں بے سبب کسی چارہ گر کی آمد کا متمنی ہے۔ اپنے ہی کاندھوں پر اپنی ناکام حسرتوں کا جنازہ اٹھائے قریہ قریہ اور شہر شہر مارا پھر رہا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی وساطت سے ہم اپنے ہی زخم خوردہ وجود، اپنے بچھڑے ہوئے سائے اور اپنے ہی ضمیر کی گلوگیر آواز کو سننے، اپنے روحانی وجود سے ہم کلام ہونے اور گوشِ سماعت سے سروشیوں کے نغمے سننے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کام کی وقعت کو پہچاننا ہر شخص کا مقدّر ہو سکتا ہے۔

پروفیسر نارنگ نے موجودہ مطالعہ کے لیے جن ہم عصر شعرا کو منتخب کیا ہے ان میں مجید امجد، منیر نیازی، مصطفٰی زیدی، جعفر طاہر، شہرت بخاری، احمد فراز، کشور ناہید، افتخار عارف، پروین شاکر، خلیل الرّحمان اعظمی، شاذ تمکنت، شہریار، وحید اختر، صلاح الدّین پرویز، محمد علوی، کمار پاشی، حنیف کیفی، محسن زیدی، رخسانہ جبیں، شکیب جلالی، اختر حسین جعفری، فارغ بخاری، عبید اللہ علیم، صابر ظفر، ثروت حسین اور سلیم کوثر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس فہرست میں اگر ان شعرا کو بھی شامل کر لیا جائے جو کلاسیکی دور، ترقی پسند اور جدید دور کی نمائندگی کرتے ہیں تو ناموں کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے بجا طور پر ہم عصر شاعری کو ہی خصوصیت کے ساتھ اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ ہمارے عہد میں مرثیہ بحیثیت صنفِ سخن نہ صرف روبہ زوال ہے بلکہ خود شاعری پر مذہب کی گرفت بھی حد درجہ کمزور پڑ گئی ہے۔ ان حالات میں شاعری کے لازمی سرچشمۂ فیضان کی جستجو کرنا اور ایک سیّال حقیقت کے بطن سے گوہر شب تاب کی دریافت اپنی افادیت کے ماسوا جراُتِ شوق کے لحاظ سے بھی ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی چیز ہے۔

پروفیسر نارنگ نے نئی شاعری کے علمی اور دیانت دارانہ تجزیے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور مماثلت کے آئینوں میں جو شکلیں دیکھی اور دکھائی ہیں وہ اپنی شناخت کے لیے ایک عرفان جو نظر اور سینے میں ایک دھڑکتے ہوئے پُرگداز دل کی بھی متقاضی ہیں جن کی غیر موجودگی میں ان نایاب جلووں تک رسائی ناممکنات میں سے ہے۔ پروفیسر نارنگ کی ناقدانہ بصیرت موضوع سے مخلصانہ وابستگی اور روحانی واردات کا سچا شعور خود اس بات کا عظیم مظہر ہے کہ مصنف نے یہ سفر محض لفظوں کے سہارے نہیں طے کیا ہے بلکہ صداقت اور خیر کی بلندی، بقا، سلامتی اور نجات کے لیے برپا ہونے والے تخلیقی اور دانشورانہ جہاد میں خود بھی برابر کا شریک ہے۔

پروفیسر نارنگ نے اپنے مقصد سے ہٹے بغیر بڑی عمدگی سے حقِ رفاقت بھی ادا کیا ہے۔ پاکستانی شاعروں میں افتخار عارف اور پروین شاکر کا مطالعہ نسبتاً زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ خصوصاً افتخار عارف کی شاعری اپنی مطلوبہ خوبیوں کے باعث زیادہ توجہ کا سبب بنی ہے۔ افتخار عارف کی ہندوستان میں مقبولیت اور ان کے شاعرانہ کارناموں کا تعارف اپنے مضامین کے ذریعے صحیح معنوں میں پروفیسر نارنگ نے ہی کرایا ہے اور بلاشبہ افتخار عارف کی شاعری استعاراتی رمزیت اور دیگر فنی و جمالیاتی خوبیوں کے سبب اپنے اندر معنی کی ایک خاص تہہ داری رکھتی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ جدید شاعری کے کُل سرمائے میں وہ تنہا ایک البیلی کائنات ہے جس کی پہچان سب سے الگ اور جس کے پھول اور پھل اپنے اندر ایک نئی تازگی، خوشبو اور رنگت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے افتخار عارف کی شاعری کے جس وصف سے ہمیں روشناس کرایا ہے وہ بھی اپنی شانِ یکتائی کے سبب بے مثال ہے۔

بلاشبہ پروفیسر نارنگ نے ایک مختصر سے مطالعہ سے جس سمت سفر کی طرف متوجہ کیا ہے اس جانب مزید پیش رفت کرنے کی بڑی گنجائش ہے اور ضرورت ہے کہ شاعری کی اندرونی کائنات میں پرورش پانے والے اس نوع کے دوسرے رجحانات کو بھی سامنے لایا جائے جو خاموشی سے اپنا کام تو کر رہے ہیں لیکن نظر نہیں آتے۔

پروفیسر نارنگ کا یہ مطالعہ گرچہ مختصر ہے لیکن غور کیجیے تو اس مختصر سی کائنات کا ہر ذرّہ اپنے جلو میں روشنی اور حرارت کا ایک سیلاب لے کر آگے بڑھ رہا ہے، ذہنوں کے بند دریچے کھولتا ہے، ہوا کا رُخ بدلتا ہے، اس دانشِ نورانی سے ایک نئی صبح کا آغاز ہوتا ہے۔

(بعارت سے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں، ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

گلہائے رنگ رنگ

سندھی کہانی

حمید سندھی / آفاق صدّیقی

ہرنی کی کہانی

یہ کسی ایک ہرنی کا قصّہ نہیں، ان تمام ہرنیوں کی کہانی ہے جن کی آنکھیں بڑی سُندر اور من موہنی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی ایسی ہی آنکھوں کی کہانی ہے جو بولنا جانتی ہیں۔ یہ کہانی ایسی ہی ایک ہرنی کی کہانی ہے جس کی بولتی ہوئی اُداس آنکھوں نے دیکھنے والوں کو کبھی نہ بھولنے والا سبق دیا۔

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے میں اپنی "مورو تی" کی دیکھ بھال کرنے گیا تھا۔ میرے ساتھ دس برس کا میرا سب سے چھوٹا بیٹا بھی تھا۔ جسے میں اس لیے ساتھ لے گیا تھا کہ وہ بھی زمینداری کے کاموں سے آشنا ہو جائے۔

جب ہم تھکے ہارے گھومتے گھماتے اپنی زمینوں پر پہنچے تو ہمارے ہاریوں نے جلدی جلدی اپنے گھروں کے باہر کھٹولے اور چارپائیاں بچھا دیں تاکہ ہم آرام سے بیٹھ کر ان سیدھے سادے کاشت کاروں سے بات چیت کر سکیں۔ کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد سفر کی ساری تھکن دُور ہو گئی۔ میں اپنے ہاریوں سے باتوں میں منہمک تھا، پھر جو اچانک مجھے دھیان آیا اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو میرا بیٹا وہاں نہیں تھا۔ پوچھنے پر ان لوگوں نے بتایا کہ "سائیں! اسے علّو کامدار اپنے گھر لے گیا ہے۔" خوشی ہوئی کہ صاحب زادے اتنی جلدی ان لوگوں سے گھُل مل گئے ہیں جو اپنے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک ہرنی کے بچّے کے ساتھ کھیلتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں۔

"ارے بیٹا! یہ کس کی ہرنی پکڑ لائے ہو؟"

"بابا! یہ ہرنی مجھے چاچا کامدار نے لاکر دی ہے۔ یہ غلامو ہاری کے بیٹے کی ہے۔ وہ تو دے ہی نہیں رہا تھا۔ بس روئے جاتا تھا۔ چاچا کامدار نے اسے ڈانٹ پلائی اور یہ ہرنی چھین لی۔"

یہ سنتے ہی میرے دل پر چوٹ سی لگی اور میں اسے سمجھانے لگا۔ "لیکن بیٹا! یہ ہرنی پرائی ہے، غلامو کے بیٹے کی ہے۔ تمہیں نہیں لانی چاہیے تھی۔"

"بابا! یہ ہرنی مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں تو اسے گھر لے جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے سی لگیں۔ میں نے کامدار کی طرف دیکھا جو میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔

"سائیں! ایسی کیا بات ہے۔ یہ سارا راج پاٹ آپ ہی کا تو ہے۔ غلامو کے رشتہ دار پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ آپ حکم کریں۔ ڈھیروں ہرنیاں پکڑ لائیں گے۔"

کامدار کی یہ بات سن کر غلامو بھی بڑی منت سماجت کے لہجے میں بولا۔ "میرے مالک! چھوٹے سرکار پر ایک تو کیا ایسی سو ہرنیاں نچھاور کر دوں۔ بات یہ ہے سائیں! اس ہرنی کو میرے بیٹے نے پال رکھا تھا اسی لیے رو رہا ہے۔ میں اسے دوسری منگا دوں گا۔ میرے سائیں! یہ ہرنی تو اب چھوٹے مالک کی ہو گئی۔"

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا چپ بیٹھا رہا۔ کامدار، غلامو، علن، جانو، دلو اور رحیمو، سبھی بول رہے تھے۔ مگر میں اب ان کی باتیں کیا سنتا، میرا دھیان تو کہیں اور تھا البتہ میری آنکھیں اپنے بیٹے پر جمی ہوئی تھیں جو ہرنی سے کھیلنے میں مگن تھا۔ بھولی بسری یادیں تازہ سی ہونے لگیں اور تصور نے مجھے اپنے بچپن کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اپنے بیٹے کی جگہ ہرنی سے میں خود کھیل رہا ہوں۔ محض زمان و مکان کا فرق تھا باقی سب کچھ وہی تھا۔ جھیل کے پہلو میں سمٹے ہوئے کالے کالے پہاڑ۔ ان پہاڑوں کے نشیب میں دور تک پھیلے ہوئے چٹیل میدان اور ان کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا گاؤں۔ مٹی کے کچے مکانوں سے قدرے فاصلے پر ایک سرکاری بنگلہ اور آس پاس ملازمین کے چھوٹے چھوٹے کوارٹرز۔ بچپن کی بے فکری اور آزادی میں مجھے یہی ماحول ملا تھا۔ میرے ساتھ میری ہی طرح اچھلنے کودنے والی چھوٹی سی ایک ہرنی بھی جس کا نام "کونجڑی" تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا، کبھی اسے دوڑاتا کبھی ہلکے ہلکے ہاتھوں سے تھپ تھپاتا اور کبھی اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کی آنکھوں کو چومتا۔

مجھے اس کی آنکھیں اتنی پیاری لگتی تھیں کہ جب میں اپنے ابو سے ان کی تعریف کرتا تو وہ ہنس کر میری امی سے کہتے۔ "تمہارا بیٹا تو شاعر بنے گا۔"

ایک دن میں اسی طرح ہرنی سے کھیلنے میں مگن تھا کہ بلاول دوڑتا ہوا آیا اور ہرنی کو رسی سے کھینچ کر زبردستی لے جانے لگا۔ "یہ ہرنی میری ہے۔ اب میں تمہیں نہیں دوں گا۔ سارا دن اسے دوڑاتے ہو۔ دیکھو تو بے چاری کتنی تھک گئی ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر ہرنی کی رسی پر قابو پانا چاہا لیکن کہاں ایک افسر کا بیٹا اور کہاں وہ دیہات کی صحت مند فضاؤں میں پلا ہوا مضبوط کاٹھی کا بچہ۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا تو میں دور جا گرا اور پھر روتا ہوا اپنے ابو کے پاس شکایت کرنے پہنچا جو ضلع کے بڑے افسر تھے اور بلاول ایک پٹے والے کا بیٹا تھا۔ بھلا میرا اور اس کا کیا مقابلہ کچھ ہی دیر بعد ہرنی ہمارے بنگلے میں پہنچا دی گئی۔ بلاول کا کوارٹر بنگلے کے قریب ہی تھا۔ رات گئے تک اس کے رونے دھونے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ برابر یہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ "بابا! میری ہرنی، بابا! میری کونجڑی" پٹے والا اپنے بیٹے کی چیخ و پکار سنتا رہا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ یہ مجال کہاں تھی کہ اپنے افسر تک بیٹے کی فریاد پہنچاتا۔

دوسرے دن بلاول کو بخار نے دبوچ لیا۔ میں ہرنی لے کر اس کے پاس گیا اور اسے راضی کرنا چاہا۔ "چلو بلاول پہلے کی طرح مل کر کھیلتے ہیں۔" لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ بس یہی ضد کرتا رہا۔ "کونجڑی میری ہے، میری ہے۔"

میں واپس پلٹ آیا اور پھر ہرنی کے ساتھ دوڑنے بھاگنے لگا۔

اسی شام کو میں اپنے بنگلے کے احاطے میں کونجڑی سے کھیل رہا تھا کہ بلاول بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "یہ میری ہرنی ہے۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا ہے کہ تم اپنی ہرنی لے جاؤ۔ میری ماں نے بیگم صاحبہ سے بات کر کے مجھے میری ہرنی واپس دلا دی ہے۔"

میں نے آنکھیں گھما کر بنگلے کی طرف دیکھا تو واقعی میری امّی باہر کھڑی ہوئی اشارے سے مجھے بلا رہی تھیں۔ مجھے دھیان آیا کہ ابّو تو دورے پہ گئے ہوئے ہیں۔ اب کون میری حمایت کرے گا۔ میری کونجڑی مجھ سے چھن جائے گی۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا ہرنی کو کھینچ کر بنگلے کی طرف لے گیا۔ امّی نے مجھے بڑے پیار سے سمجھایا مگر میری آنکھیں تو ہرنی پہ لگی ہوئی تھیں جو چبوترے کے پاس آرام سے بیٹھی تھی۔

اس وقت نہ جانے کیوں میں نے اتنی بے عزّتی محسوس کی۔ فوراً دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ اس وقت نہ مجھے ہرنی کی جولانیاں یاد رہیں اور نہ اس کی من موہنی آنکھیں۔ میں بڑی رازداری سے چُپ چاپ چبوترے پہ چڑھ گیا اور ایک بھاری پتھر اٹھا کر ہرنی پہ دے مارا۔ اس کا سر بُری طرح کُچل گیا اور آن کی آن میں وہ خوبصورت آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں جن میں اب ایسی حسرتیں اور صدیوں کی صدائیں گونج رہی تھیں جن کی فریاد و فغاں سے ساری وادی لرزہ براندام محسوس ہو رہی تھی۔ غریب بلاول ہرنی کے مُردہ جسم پہ اپنی آنکھیں مَل مَل کر چیخیں مار رہا تھا اور میں ساکت و حیرت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا جیسے بلاول اور ہرنی کی آنکھوں میں کوئی فرق نہ رہا ہو۔

آج جب میرا بیٹا ایک ہرنی کسی سے چھین کر لایا تو میں لرز کر رہ گیا۔ ماضی کا المناک سایہ مجھے حال پر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ بھولی بسری تلخ یادوں کی گرفت سے خود کو بچانے کے لیے دفعتاً میں چونکا تو میرا بیٹا مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"بابا سائیں! وہ ہے غلامو کا بیٹا۔" میں نے اس کے اشارے پہ نظر ڈالی تو ایک چھوٹا سا لڑکا اپنے ننھے جھکائے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کلہاڑی پکڑے کھیتوں کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے فوراً غلامو سے کہا کہ اس لڑکے کو آواز دے کر بلائے۔ غلامو نے اسے پکارا۔ پہلے تو پلٹ کر وہ ہماری طرف گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے قریب آیا۔ میں نے دیکھا کہ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو کر اُبلنے سی لگی ہیں۔

"بیٹا! اِدھر آؤ، تمہیں ہرنی چاہیے۔" یہ سنتے ہی میرا بیٹا بے تاب ہو کر چیخنے لگا۔ "نہیں بابا نہیں، میں ہرنی نہیں دوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے خوشی کی جو چمک دمک تھی اس پہ مایوسی کا سایا پڑنے لگا تھا۔

"نہیں سائیں! اب یہ ہرنی چھوٹے مالک کی ہے۔" غلامو نے یہ کہہ کر اپنے بیٹے کو ڈانٹا۔ "جا رے جا، بکریوں کو دیکھ۔" لیکن میں نے اچانک اسے روکا۔ "ادھر آؤ بیٹے! ہم ہرنی تم سے لیں گے مگر ایسے نہیں.... لو یہ پیسے لو۔ ان سے تم دوسری ہرنی لے لینا۔" پچاس روپیہ کا نوٹ اس نے میرے کہنے سے لے تو لیا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ آنکھیں اُس ہرنی پہ لگی ہوئی تھیں جو دُور ایک درخت سے بندھی بیٹھی تھی۔

وفعتاً اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں میں نہ مجھ سے بات کرنے کی تمنا تھی نہ کوئی التجا۔ ہاں جوش اور بغاوت کے شعلے سے بھڑکے ہوئے تھے۔ وہ اُچھل کر تیزی سے ہرنی کی طرف بڑھا تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہونے لگا۔ جیسے میں پتھر کا بن گیا ہوں۔ اس کی تیزی، طراری اور پھرتی حیران کن تھی جس نے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے ہرنی کی گردن کاٹ دی۔ بس ایک بجلی تھی لہرا کے اٹھی اور گری۔ پھر خون آلودہ کلہاڑی کو اس نے فضا میں اچھال دیا، میرے دئے ہوئے نوٹ کو پھاڑا اور چیختا چلّاتا ہوا کھیتوں میں گم ہو گیا۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ میں بڑے بوجھل بوجھل سے قدم اٹھاتا ہرنی کے پاس گیا۔ وہی آنکھیں، وہی التجائیں، وہی صدائیں۔

سب ہرنیاں شاید ہرنیاں ہی ہوتی ہیں۔ ایک جیسی من موہنی آنکھوں والیاں۔ جن کی آنکھوں میں وہی التجائیں اور وہی صدیوں کی صدائیں . . . لیکن انسان کتنا مختلف ہے؟ میرے سامنے بلاول کی آنکھیں ہیں اور پھر غلاموں کے بیٹے کی آنکھیں، کتنا فرق تھا دونوں کی آنکھوں میں؟

میں سوچنے لگا "زمان و مکان کا فرق کتنا بڑا ہے" پھر میں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو ہرنی سے لپٹا ہوا چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ بلاول بن گیا ہو۔

کتابی صورت میں پہلا مبسوط جائزہ

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

حیات اور علمی خدمات

مصنّفہ

شہاب الدین ثاقب

صفحات: ۲۵۶ — قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

گلہائے رنگ رنگ
نثری نظم

یونس امریہ / احسن علی خان

ماہِ نو

(یونس امریہ کا ۱۳۲۰ء کے لگ بھگ یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں انتقال ہوا)

جبیں میری زمیں پر جب بھی جھکتی ہے
نکلتا ہے زمیں پر ماہِ نو میرا
بہاراں میں بدل جاتا ہے ہر موسم
مرا ہر روز، روزِ عید ہوتا ہے
چھٹکتی چاندنی پر چاندنی میرے
نہ ڈالے کوئی بھی بادل سیہ سائے
نہ دھندلائے کبھی بھی چاندنی اس کی
زمیں سے ہو فلک تک روشنی اس کی
مرے ویران سے، سنسان سے دل میں
جب آئی روشنی تو تیرگی بھاگی
جہاں یہ چاند میرا جلوہ فرما ہو
وہاں تاریکیٔ غم کا گزر کیا ہو
مجھے اب کیا غرض ہے آسمانوں سے
کہ میرا تو زمیں پر چاند نکلا ہے
زمیں پر جس جگہ میری نگاہیں تھیں
وہیں سے ابرِ رحمت کا برستا ہے
غضب کیا ہے اگر یونس ہوا عاشق
کہ عاشق ہیں خدا کے اور بہتیرے
سرِ تسلیم خم کرتا ہے یونس بھی
کہ عشّاقِ الٰہی غم سے سوزاں ہے

گلہائے رنگ رنگ

ترکی نظم

فضل حسن داغلرجہ / احسن علی خان

(دورِ حاضر کے ایک ممتاز ترکی شاعر فضل حسن داغلرجہ، پیدائش ۱۹۱۴ء)

وسیع دنیا

وہ ترکی ہو کہ افریقہ کہ ہندستاں
جہاں جاؤ وہاں ہر چیز ہے یکساں
وہ ترکی ہو کہ ہندی ہو کہ افریقی
سبھی کو زندگی سے پیار ہے کتنا
سبھی کو موت سے ڈرتے ہوئے دیکھا
زباں کچھ ہو،
نظر کی گفتگو کو سب سمجھتے ہیں
زباں کچھ ہو،
مگر سب اک فضا میں سانس لیتے ہیں
ہم انساں کیوں جدا ہیں؟ اجنبی کیوں ہیں؟

یہ ملکی سرحد ایسی تیغ ہے جس نے
ہم انسانوں کی خوشیوں کے گلے کاٹے
ہم انساں ہی جدا کیوں اجنبی کیوں ہیں؟
پرندے آسماں میں بھائی ہوتے ہیں
جہاں میں بھیڑیے بھی مل کے رہتے ہیں

گوشۂ طلبہ

نسیم احمد

تعلقاتِ عامہ ــــ قصۂ قدیم و جدید

قدیم

رومن سلطنت کے زوال اور اٹھارویں صدی کے عہدِ روشن خیال کے درمیان تیرہ صدیاں گزریں۔ تاریخ کی اس طویل مدت کو، جس کے ریکارڈ موجود ہیں، دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تاریک دَور، جب کہ یونانی، رومن تہذیب کے کھنڈرات پر بربری حملہ آور ایک جداگانہ تہذیب کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اس دور میں ایک طویل مدّت تک رائے عامہ نے ملکی معاملات میں بہت کم کردار ادا کیا۔ لیکن ۱۴ویں سے ۱۶ویں صدی عیسوی کا زمانہ یورپ کا سنہری دَور تصوّر کیا جاتا ہے، جب دنیا کے اس خطّہ میں جدید ترقیوں کی ابتدا ہوئی۔ اس دور کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرے دَور میں جدید علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی رائے عامہ کی اہمیت کو محسوس کیا گیا اور اس پر خاص زور دیا گیا۔ تاہم اوّل الذکر دَور میں رائے عامہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

دو تحریکیں یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں دو تحریکیں ابھریں۔ ایک لادینی تحریک تھی، جس نے انسان کو نیچر اور معاشرے کے متعلق چھان بین کرنے کا حق دینے پر زور دیا۔ دوسری تحریک تجدید مسیحیت کے لیے میدانِ عمل میں آئی، جس میں سخت مذہبی پابندیوں کے شکنجے سے نکلنے اور انفرادی شعور کی آزادی پر زور دیا گیا۔ اگر یہ دو تحریکیں منظرِ عام پر نہ آتیں تو تعلقاتِ عامہ اس صورت میں، جو آج ہمارے سامنے ہے، موجود نہ ہوتے۔ ان دو تحریکوں نے اہلِ یورپ میں بڑی حد تک بیداری پیدا کی۔ اس زمانے میں یونانیوں اور رومیوں کی معلومات کو زندہ کر کے رائے عامہ کو ترقی دی گئی نشاۃ ثانیہ کی بدولت افراد اور رُوح کی آزادی کو فروغ دے کر جمہوری تصوّرات کو ترقی دی گئی۔ دنیا کے نئے خطّے دریافت کرنے کے لیے اس زمانے میں جو بحری سفر کیے گئے، اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب امریکہ اور افریقہ سے روشناس ہوئی۔ مواصلات کے میدان میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ جس سے طباعت، حمل و نقل کے وسائل اور تجارت میں اہم تبدیلیاں بروئے کار آئیں اور اس کے جلو میں تبدیلیوں کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دَور میں انسانی ذہن کو آزادی نصیب ہوئی تاکہ وہ اپنے مسائل پر خود غور و خوض کرے اور لوگوں کو ترغیب دلائے کہ وہ ان کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کریں۔

نیا رجحان | انسانی ذہن کو آزادی ملی تو آزادانہ بات چیت کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ اظہارِ خیال کی آزادی کے ساتھ ایک نئے رجحان نے جنم لیا، اور وہ یہ تھا کہ عوام اور تحریکوں کو عوامی مفاہمت اور تعلقاتِ عامہ کی اہمیت کا احساس ہوا، اور وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں اس پر انحصار کرنے لگے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ عوام برسرِ اقتدار طبقہ پر تکیہ چینی کرنے لگے جو اس سے پہلے کے دور میں مفقود تھی۔ عوامی تحریکوں اور افراد کو اہمیت حاصل ہوئی، جس سے عوامی رہنماؤں، ان کے پیروکاروں اور معاشرے کے مختلف گروپوں کے درمیان باہمی روابط کو فروغ حاصل ہوا۔

کلیسا اور تعلقاتِ عامہ | ازمنۂ وسطیٰ میں کلیسا اور سلطنت دونوں ایک ہی چیز تھیں۔ کلیسا کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل تھا اور مذہبی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ رائے عامہ کو حسب منشا سانچے میں ڈھالتا تھا۔ اور اس کے اختیارات کے موثر ہونے کا دار و مدار تعلقاتِ عامہ کی سرگرمیوں پر تھا۔ اس زمانے میں تمام عوامی افکار کا تعین بنیادی طور پر کلیسا کی طرف سے کیا جاتا تھا کیونکہ یہی وہ طاقت تھی، جو تبلیغ، وعظ و پند، نقاشی، بت تراشی، گیت اور مذہبی رسوم کے ذریعے اپنے تصورات کی تشہیر کر کے لوگوں میں اتحاد برقرار رکھتی تھی۔ کلیسا اپنے تعلقاتِ عامہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے سیاسی اور فوجی کارروائی بھی عمل میں لاتا تھا جیسا کہ صلیبی جنگوں میں اسی تعلقاتِ عامہ کی بدولت تمام مسیحی حکمرانوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں ایک پرچم تلے جمع کیا گیا۔

انگلستان میں امرا اور تاج کے درمیان مسلسل کشمکش کے نتیجے میں شاہِ برطانیہ کو ایک دستاویز جو "میگنا کارٹا" (MAGNA CHARTA) کے نام سے مشہور ہے، پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا۔ برطانیہ کے شاہ جان نے ۱۲۱۵ء میں اس منشورِ آزادی پر دستخط کیے جس کی رو سے انگریز قوم کو شخصی اور سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ یہ دستاویز بے حد اہمیت کی حامل تھی اور اس کی بدولت تعلقاتِ عامہ کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ امریکی آئین اور حقوقِ انسانی کے امریکی مسودۂ قانون کے لیے اساس ثابت ہوئی۔ اس منشور نے اظہارِ خیال کی آزادی، ترغیب اور اختلافِ رائے کے حق کی بنیاد ڈالی۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ | جب ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی عیسوی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے مغربی معاشرے کی کایا پلٹ دی تو تجدیدِ مسیحیت کی تحریک جو ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، نے ۱۶ ویں صدی میں تبدیلیوں کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ نشاۃ ثانیہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں ادب، مصوری، بت تراشی، سائنس اور فلسفہ کی ترویج ہوئی، یونیورسٹی ایجوکیشن کو ترقی ہوئی، معاشرتی معیار بلند ہوئے۔ اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین پیدا ہوئے۔ اسکالروں اور دانشوروں کی اہمیت میں اضافہ ہوا، جنھوں نے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں خصوصی کردار ادا کیا۔ ۱۶ ویں صدی کی مذہبی اصلاحات ایک لحاظ سے یورپی حکومتوں کے کلب کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف بغاوت تھیں۔ یہ دراصل کلیسائی اختیارات کے خلاف خیالات اور رائے عامہ کا احتجاج تھا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں رائے عامہ کو برتری حاصل ہوئی اور سنسر شپ کا خاتمہ ہوا جس کے نتیجے میں آزادانہ عوامی بات چیت ممکن ہوئی اور عوامی رہنماؤں نے تعلقاتِ عامہ پر زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا۔ انگلستان نے پریس کو لائسنس دینے کا قانون ۱۶۶۵ء میں اور فرانس نے ۱۷۸۹ء میں بغاوت پھوٹ پڑنے پر ختم کیا۔ امریکہ نے ۱۷۹۱ء

بین حقوقِ انسانی کے مسودۂ قانون میں تقریر، پریس اور اجتماع آزادی کے حق کو تسلیم کیا۔

اس وقت تک مغربی دنیا میں صنعتی انقلاب کی لہر اٹھ چکی تھی جس کے جلو میں یورپی معاشرے میں دُور رس تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ جدید سائنس، نئی ایجادات اور ٹکنالوجی کے ارتقا اور مواصلات کے لئے ذرائع کی ترقی اور جمہوریت و خواندگی کی ترویج و اشاعت سے ایک نیا دور شروع ہوا، جس میں رائے عامہ اور تعلقاتِ انسانی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوئی جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

نئی اصطلاحات اور اخبارات کا اجراء سترھویں صدی میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے نئی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ چناں چہ جس وقت کلیسائے روم کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی، پروپیگنڈا اور پروپیگنڈا باز جیسی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ پیوریٹن انقلاب میں ایجی ٹیشن (سیاسی ہلچل) اور ایجی ٹیٹر (شورشی) جیسی اصطلاحوں نے جنم لیا۔ اس دور کی سب سے نمایاں ترقی اخبارات کا ارتقا تھا۔ اسی صدی میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے خبرنامہ کو رواج دیا گیا جو مختلف تاجر رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لیے جاری کرتے تھے۔ سب سے پہلا خبرنامہ جرمن تاجروں اور بنکاروں نے اگست ۱۶۰۹ء میں شائع کیا پہلا جرمن روزنامہ فرینکفرٹ میں ۱۶۱۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور پہلا انگریزی روزنامہ ۱۶۲۲ میں شائع ہوا۔ اسی طرح پہلا فرانسیسی اخبار "گزٹ" ۱۶۳۱ء میں جاری ہوا۔

انگلستان میں پیوریٹن انقلاب کی بدولت پریس کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ابتدائی دور کا ایک رسالہ "موڈریٹ" جو رائے عامہ کو برانگیختہ کرنے کے لیے وقف تھا، ۱۶۴۸ء میں شائع ہوا۔ اسی سال لندن کے ایک پرچہ میں پہلا اخباری اشتہار منظرِ عام پر آیا۔

ان تمام مطبوعات سے خیالات کی ترویج و اشاعت کے نئے ذرائع مہیا ہو گئے جس کی بدولت عوام نے ان معاملات میں جو ان کی زندگی سے متعلق تھے، بحث و تمحیص میں حصہ لینا شروع کیا۔ انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں اخباروں، کتابوں اور ہفتلوں کے ذریعے ترویج و ترقی سے تعلقاتِ عامہ کا دائرہ وسیع تر ہو گیا جسے اب نئی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی سطحوں پر کام میں لایا جا سکتا تھا۔

جدید سماجی نظریات انیسویں صدی کے اوائل میں فرانسیسی انقلاب اور صنعتی انقلاب سے جدید سماجی نظریات ابھرے جن کے پروپیگنڈے نے بیسویں صدی کے معاشرے پر دور رس اثر ڈالا۔ چناں چہ سوشلسٹ، کمیونسٹ اور اس قسم کے دوسرے نظریات کی ترویج و اشاعت یونان میں افلاطون نے کی۔ اور ازمنۂ وسطیٰ میں جب کہ اصطلاحات کا دور شروع ہو چکا تھا، مذہبی جماعتوں نے یہ کام انجام دیا۔ البتہ جدید سوشلزم فرانسیسی انقلاب کے دوران منظرِ عام پر آیا جس کے نتیجے میں فرانسیسی مفکروں اور بعض انگریز تاجروں نے سوشلزم کے نظریات کو مقبول بنانے کے لیے رائے عامہ جیتنے کی کوشش کی۔

جدید

تعلقاتِ عامہ دورِ جدید کا ایک اہم فن ہے۔ کسی صنعتی ادارے اور اس میں کام کرنے والے مزدوروں اور کارکنوں کے درمیان خوش گوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس فن کے تمام لوازمات سے پوری واقفیت

حاصل کی جائے جس طرح اس دور کی پیچیدہ زندگی کی ہر سرگرمی اور ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے، اسی طرح تعلقاتِ عامہ کے وجود کی بھی ایک فلسفیانہ وجہ ہے جسے ہماری زندگی میں ایک روحِ رواں کی حیثیت حاصل ہے۔ معنی کے لحاظ سے اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے:

(۱) معلومات، جو عوام کو فراہم کی جائے۔
(۲) ترغیب، جس کا مقصد عوام کے رویّہ اور طرزِ عمل میں مناسب تبدیلی پیدا کرنا ہو، اور
(۳) ربط اور ہم آہنگی، ادارے اور عوامی طبقوں کے درمیان پیدا کی جائے۔

اس فن کو جس قدر اہمیت آج حاصل ہوگئی ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کیوں کہ جدید معاشرتی سائنس کی تحقیق سے یہ پتا چلا ہے کہ افراد، گروپوں اور اداروں کی زندگی سے ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنا تمام افراد کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔

تعلقات میں عدم مطابقت تعلقاتِ عامہ کے شعور یا اس کی پیشہ ورانہ رہنمائی کی آج ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ معاشرہ بہت پیچیدہ ہوگیا ہے اور گزشتہ چند صدیوں میں اس نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، ان میں اس کے ارتقائی عمل کی رفتار میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ بہت سی قوتیں جن سے معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے، ان کی ترقی کی رفتار نسبتاً غیر ہموار رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی تعلقات میں عدم مطابقت اور کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ چوں کہ ٹکنالوجی نے تعلقاتِ عامہ کی سائنس کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے اس لیے انسانی معاشرہ ٹکنالوجی کی ترقیوں کے قدم بہ قدم چلنے میں بہت حد تک ناکام رہا ہے۔

تطابقِ ماحول (ADJUSTMENT) کے نئے پیشے کے ابھرنے کی متعدد وجوہ ہیں۔ ان میں معاشرہ کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی، ذرائع کا فنی ارتقا، روز افزوں تعلیم اور ناخواندگی، تیز رفتار ٹرانسپورٹ اور مواصلات شامل ہیں۔ ان تمام چیزوں نے خیالات اور افکار کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے۔

معاشرتی سائنس کی ترقی نے نئی راہیں کھول دی ہیں اور تہدید و تخویف کے استعمال کے بجائے ترغیب اور تحریص کی اہمیت کا احساس پیدا کیا ہے۔ اور ووٹ کے حق کا دائرہ بھی وسیع کر دیا گیا ہے۔ دیگر وجوہ میں مساوات پسندی کی طرف بڑھتا ہوا رجحان اور اس تصوّر کی طرف عام میلان کہ نجی اور سرکاری مفاد کو ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ مرکزی حکومت پر بیشتر انحصار اور اجتماعی حمایت پر حکومت کا بڑھتا ہوا انحصار شامل ہیں۔ تعلقاتِ عامہ کی سائنس میں ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ عوام سے متعلق تمام پالیسیوں اور اعمال میں سرکاری اور نجی مفادات میں مطابقت ہونی چاہیے۔

ہیرلڈ لاسویل (HAROLD LASWELL) نے ۱۹۳۴ء میں انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز میں تعلقاتِ عامہ کے مُشیر کی تعریف میں یہ امتیازی خصوصیت بیان کی ہے۔

"تعلقاتِ عامہ کے مُشیر کو محض ایک ہرکارہ کی حیثیت حاصل نہیں ہے، جس کا کام پیغامات اِدھر سے اُدھر

پہنچانا ہوتا ہے اور جس کے لیے اسے معاوضہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس اوّل الذکر کسی خاص کاروباری ادارے کے پالیسی سازوں کے ساتھ گہرے تعاون کے ساتھ کام کرتا ہے جس کے وسیع تر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ تعلقاتِ عامہ کا مشیر تجارت کے تمام پہلوؤں کو جن میں مواصلات، مارکیٹ کی پالیسی اور قرضے کے طریقے شامل ہیں، تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ پالیسی کے امور میں دور رس اہم تبدیلیوں کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا یہ پہلو تقریباً تمام لوگ جانتے ہیں۔ لیکن جو چیز عام نظروں سے اوجھل ہے وہ یہ ہے کہ تعلقات کا مشیر عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی لہروں کا جائزہ لینے کی خصوصی تربیت حاصل کرتا ہے۔ وہ تجارتی پالیسی مرتب کرنے والوں پر یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ انھیں ذاتی مفادات کی ایسی پالیسی وضع کرنی چاہیے جس کا دائرہ وسیع ہو۔"

انتہائی مطابقتِ ماحول اور ہم آہنگی اس مرحلہ پر حاصل ہوتی ہے جب کہ ذاتی مفاد کو باشعور طریقے پر مدِ نظر رکھا جائے۔ تعلقاتِ عامہ کے مشیر کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ذات میں اس قسم کی بیدار مغزی اور شعور برقرار رکھے۔ جس زمانے میں عوامی مفاد کے حصول کے اسباب میں ذاتی مفاد سب سے بڑا عامل تھا۔ اس وقت اخباری نمائندے اور نشر و اشاعت سے متعلق افراد عوام کے سامنے یک طرفہ مفاد کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب زمانہ بدل گیا اور سماجی ذمہ داری کے تصوّر کو عوامی دباؤ کے نتیجے میں بالادستی حاصل ہوئی تو تعلقاتِ عامہ کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔

سماجی سائنس داں | یہ سچ ہے کہ معاشرے نے ابھی تک اس پیشہ کو ناواقف، غیر اخلاقی اور سماج دشمن غیر ترقی یافتہ کارکنوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے قانونی پابندیاں عائد نہیں کی ہیں لیکن اس میدان میں جو رہنما حقیقی معنوں میں سرگرمِ عمل ہیں وہ اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی کا بہترین مظاہرہ کر رہے ہیں۔ تعلقاتِ عامہ کے مشیر کی سرگرمیاں تین خاص میدانوں ــ مواصلات، اجتماعی ترغیب اور افراد و گروپوں کے درمیان ربط و ہم آہنگی پیدا کرنا ــ کے لیے وقف ہیں۔ حقیقی معنوں میں وہ ایک عملی سماجی سائنس داں کی حیثیت رکھتا ہے جو انتظامیہ کو پالیسی کے امور پر مشورہ دیتا ہے۔ تعلقاتِ عامہ کے سلسلے میں اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اپنے زیرِ اثر افراد کے نقطہ ہائے نظر عوام کے سامنے اور عوام کے نقطہ ہائے نظر ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کی اہلیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسی کہ ایک صنعتی انجینئر یا سرمایہ کاری کے مشیر کی ہوتی ہے۔

تعلقاتِ عامہ بذاتِ خود کوئی سائنس نہیں ہے لیکن درپیش مسائل حل کرنے میں اس کا اندازِ فکر سائنسی، عوامی مرضی، انسانیت اور تعلقاتِ انسانی پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم جو اصطلاح بھی چاہیں اسے دے سکتے ہیں۔ تاہم تعلقاتِ عامہ کی سرگرمیوں کی ایک مخصوص منزل عوامی بہبود اور خیر سگالی ہے۔ درحقیقت خیر سگالی عوام اور تنظیموں کا سب سے زیادہ ٹھوس اثاثہ ہے جس کا انحصار افراد اور عوامی طبقوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پر ہوتا ہے۔

دو طرفہ راستہ | اس موقع پر نشر و اشاعت اور تعلقاتِ عامہ کے درمیان فرق کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ نشر و اشاعت یک طرفہ راستہ ہے جب کہ تعلقاتِ عامہ کو دو طرفہ راستے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید کے تعلقاتِ عامہ

کا وجود، انفرادی اعمال، بالخصوص تجارت میں عدم مداخلت کا مرہونِ منت ہے۔ امریکہ میں یہ عدم مداخلت سولہویں صدی کے اوائل میں بروئے کار آئی اور یہ ان مصلحتوں کے تحت وجود میں آئی جن کا مقصد عوام کے مختلف طبقوں میں مساوات اور ان کی آزادی کو برقرار رکھنا تھا۔

امریکہ اور یورپ کے مختلف ممالک میں تعلقاتِ عامہ کے پیشہ میں جو نااہل، کم تعلیم یافتہ اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک قانون کے ذریعے اس پیشہ سے نکال دیا گیا۔ یہ گویا اس پیشہ میں تطہیر کی مہم تھی۔ چناں چہ تعلقاتِ عامہ کے مشیروں اور کارکنوں کے لیے معیار مقرر کیے گئے تھے اور ان پر سختی سے عمل درآمد کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ رائے عامہ نے اپنی سرگرمیوں میں اس کی بھرپور حمایت کی، پھر قانون کے ذریعے اس معیار پر عمل درآمد ضروری قرار دیا گیا۔

ہمارے لیے بھی یہ کوئی نرالا مسئلہ نہیں ہے۔ جس طرح ڈاکٹری، وکالت اور دیگر پیشوں کے لیے تعلیم اور معیار مقرر کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تعلقاتِ عامہ کے پیشہ میں شامل ہونے والوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے والوں کے لیے ضروری تعلیم اور معیار متعین کرے تاکہ نااہل لوگوں کو اس میں داخل ہو کر اسے بدنام کرنے کا موقع نہ ملے۔

تعلقاتِ عامہ کے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ اور اہل ہونے کے علاوہ اعلیٰ فرض شناسی کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں جب ہی وہ معاشرہ کو مربوط کرنے کے لیے فرائض منصبی کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گے۔ اس طرح ہم سب کے لیے بہتر زندگی کے سامان مہیا ہوں گے۔

نسّاخ

(حیات و تصانیف)

ڈاکٹر محمد صدر الحق ——— قیمت: ۳۰ روپے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

اسلوبیاتِ میرؔ

از: گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تماشا طلب آزار ـــــــــــــ مصنف: قمر ہاشمی

صفحات: ۲۱۵ - قیمت: ۵۰ روپے

پتا: ایل/۱۳ سیکٹر ۵ اے/۴ گلشنِ لیاقت نارتھ کراچی

"تماشا طلب آزار" قمر ہاشمی کا وہ صحیفۂ محبت ہے جس میں ہمارے بہت سے مرحوم شاعر اور ادیب چلتے پھرتے شعر سناتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ قمر ہاشمی نے بڑی محبت سے ان کا ایک مرقع تیار کیا ہے جس کے خطوط اور نقوش سے ہر فن کار کی انفرادی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ انھوں نے اس مجموعے میں تقریباً ستر فن کاروں کا منظوم تعارف پیش کیا ہے۔ یہ تعارف خراجِ عقیدت کی شکل میں بالعموم ان لوگوں کی وفات پر قلم بند کیا گیا ہے۔ تاہم بعض ایسے اکابر فن کار بھی محبت کے اس مرقعے میں شامل ہیں جن سے قمر ہاشمی کو خصوصی دل چسپی اور عقیدت ہے۔

اس مرقع میں حضرت امیر خسرو، شاہ عبداللطیف بھٹائی، قرۃ العین طاہرہ، غالب، اسماعیل میرٹھی **اور اقبال** جیسے اکابرِ ادب کی خدمت میں پیش کیا جانے والا منظوم خراجِ تحسین بھی ہے اور بزرگ اور معاصر فن کاروں کے بارے میں ذاتی تاثرات کا اظہار بھی۔ ہر نظم اپنی جگہ ایک مکمل فن پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے فن کار کی ذاتی اور انفرادی خصوصیت کے ساتھ ساتھ اس محبت و عقیدت کا بھی احساس ہوتا ہے جو قمر ہاشمی کے دل میں موجزن ہے۔

قمر ہاشمی نے ایک بہت اچھا کام یہ کیا ہے کہ ہر فن کار کی تاریخِ وفات واضح طور پر درج کی ہے۔ اس وقت تک کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں ہوئی جس میں ہمیں معاصر فن کاروں کی تاریخ ہائے وفات یکجا مل جائیں۔ بعض اوقات اس کی تلاش میں بڑی کد و کاوش کرنا پڑتی ہے۔ "تماشا طلب آزار" کی اشاعت سے آزارطلبی میں کسی قدر کمی ضرور واقع ہوتی ہے۔ آج سے بہت پہلے ایک بزرگ نے "مخبر الواصلین" کے عنوان سے ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صوفیائے کرام کے قطعہ ہائے تاریخ یکجا کر دیے گئے تھے۔ تاکہ تاریخوں کی تلاش میں کوئی دقت نہ ہو۔ ہاشمی صاحب نے بھی یہ کام بہتر طریقے اور ذاتی تاثر کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اگر تاریخِ وفات کے ساتھ ساتھ تاریخِ ولادت بھی درج کر دی جاتی تو کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوتا امید ہے کہ نقشِ ثانی میں اس طرف بھی توجہ کی جائے گی۔

احمد ندیم قاسمی، شان الحق حقی اور سید محمد تقی نے اس کتاب پر معنی خیز دیباچے لکھے ہیں اور خود قمر ہاشمی نے بھی "انجمنِ دل کا گداز" کے عنوان سے اس کتاب کی تخلیق کا پس منظر بیان کیا ہے۔ فن کاروں کی تصاویر بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جن سے اس کتاب کی دل کشی بہت بڑھ گئی ہے۔

کتاب کی کتابت و طباعت اور سرورق عمدہ ہے۔

ــــــــــ ڈاکٹر اسلم فرخی

تصوّف کی حقیقت

مصنف: ثناء الحق صدّیقی

صفحات: ۱۶۰ ــ قیمت: ۱۰ روپے

پتا: ادارۂ دانش وحکمت، ڈی ۱۳ ــ بلاک بی ــ نارتھ ناظم آباد ــ کراچی

تصوّف جیسے پیچیدہ اور کسی قدر متنازع موضوع پر قلم اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، پھر اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالنا تو اور بھی مشکل مرحلہ ہے۔ کہ اس کے لیے وافر مطالعہ اور بسیط نگاہ کی ضرورت ہے، کتاب مذکورہ کے مصنف ثناء الحق صدّیقی صاحب اس کے ہر طرح اہل ہیں کہ اس موضوع پر ان کا گہرا مطالعہ ہے اور اس بارے میں وہ ایک نقطۂ نگاہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوّف باہر کی چیز ہے۔ اس سے اسلام جیسے سیدھے سادے دین میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ثناء الحق صاحب کے اخذِ نتیجہ سے اختلاف مشکل ہے۔ یہ بات تو درست ہے کہ اسلام میں تصوّف کا پیوند دسا ور ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں مسلمانوں کا مفتوحہ علاقے کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت سے واسطہ پڑا اور شعوری و غیر شعوری سطح پر لین دین کا عمل جاری ہوا تو اس لین دین کے عمل میں تصوّف بھی ہماری تہذیب و ثقافت میں داخل ہو گیا۔ ہر نئی چیز کی طرف لوگ مڑ کر دیکھتے ہیں کہ یہ ان کی جبلّت میں شامل ہے لہٰذا مذہب کی سطح پر اس کی پذیرائی شروع ہوئی۔ پھر دیکھتے دیکھتے یہ ایک مدرسۂ فکر کی صورت اختیار کر گیا اور آگے چل کر یہ سلسلہ شاخ در شاخ ہو گیا۔

اس بارے میں جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں وہ یہ ہیں کہ بنی اُمیّہ کے آخری دور اور بنو عباسیہ کے تمام تر دور میں علمائے سو کی کثرت ہو گئی تھی۔ وہ صاحبِ اقتدار کے "لیس مین" ہو کر رہ گئے تھے۔ لہٰذا ان علمائے سو کے خلاف علمائے حق یا حق پرست حضرات نے جو آواز بلند کی وہ اس حلقے کے کہلائے یا اس حلقے کا سہارا لیا۔ اگرچہ کتاب کے مصنّف نے مثالوں کے ذریعے سے اور تاریخی شواہد کی بنا پر اس خیال کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ بنو اُمیّہ کے زوال کے بہت بعد تصوّف کی ابتدا ہوئی اور اس دور کے صوفی نہایت غیر معروف حضرات تھے جن کا آج تصوّف کے سلسلوں میں ذکر بھی نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ پندرھویں صدی بلکہ سولھویں صدی کے اوائل تک صوفیا کا مطمحِ نظر غیر مسلموں میں تبلیغِ دین اور مسلمانوں میں احیائے دین تھا۔ اس کی ترویج کے لیے انھوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے لیے حلم، فروتنی اور سادگی کے اوصاف منتخب کیے لیکن اس میں زوال کے آثار اس وقت پیدا ہوئے جب یہ حلقہ خانقاہیت میں بدلا۔ بہت طرح کے رطب و یابس اس میں داخل ہو گئے اور اس طرح سیدھے سادے دین کے اوپر خود مختزع اسلامی اصولوں کے جالے بُن دیے گئے۔

جناب ثناء الحق صدّیقی نے اپنی کتاب میں نہ صرف ان جالوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے بلکہ ان کُنہیات کی طرف بھی

اشارہ کیا ہے جن سے لوگوں کو پرہیز کرنا چاہیے۔ ان کی کتاب "تصوّف کی حقیقت" یہ ہر حال پڑھنے کی چیز ہے۔

——— ا-س

ترانہ ——— مصنفہ: آئین رینڈ، مترجم: آصف فرخی

صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۲۰ روپے

پتا: احسن مطبوعات، بی ۱۵۵۔ بلاک ۵ گلشنِ اقبال، کراچی

آئین رینڈ کا مختصر ناول "ترانہ" شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، موسیقی کی اصطلاح میں یہ فکری جہت کا ترانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئین رینڈ کی وہ فکری جہت کیا ہے؟ تو عرض ہے کہ وہ اس کا "میں" ہے جس کی وہ ہر حال میں سربلندی چاہتی ہے۔ آئین رینڈ ایسے معاشرے کی طلب گار ہے جہاں "میں" کا بول بالا ہو اور اس کی انفرادیت پوری قوت سے اپنے منظر نامے میں ابھرے۔ بہ الفاظ دگر وہ اس اجتماعیت کے نظام اور اس سے بندھے ہوئے معاشرے کے خلاف ایک چیلنج اور سرتاسر احتجاج ہے جہاں فرد کی سوچ، فرد کی سوچ نہیں رہتی اور جہاں انسان اپنے معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ اس کے لیے یہ فیصلہ بھی اسٹیٹ کی "مجلسِ تعیینِ صلاحیت" کرتی ہے۔

آئین رینڈ کی "میں پسندی" کا خواب اس انتہا کو پہنچا ہوا ہے کہ جہاں اس کا بے نام کردار جس کی خود کلامی پر ناول کا آغاز و انجام ہوتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے "........ یہ تب ہوا جب میں نے اپنے گھر میں ملنے والی کتابوں میں سے پہلی کتاب پڑھی اور اس میں لفظ "میں" لکھا ہوا تھا، اور جب میں اس لفظ کو جان گیا تو کتاب میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑی اور میں بے اختیار رو پڑا۔ میں، کہ جس نے کبھی آنسوؤں کا ذائقہ نہ جانا تھا۔ میں اپنے تمام بھائی انسانوں کی نجات اور ان کے غم میں رویا۔ میں اس نعمت کو جان گیا جسے میں نے اپنا عذاب سمجھا تھا، میں جان گیا کہ مجھ میں میری سب سے اچھی بات میرے گناہ اور میرے انحراف تھے۔"

اجتماعیت کے نظام کی رد میں آئین رینڈ جس طرح کے نظام کی تمنائی ہے۔ اس میں ناولٹ کے بے نام کردار (ہیرو) کی مخاطب "سنہری بدن" اس کو پرومیتھیس کا نام دینا چاہتی ہے۔ اساطیر میں پرومیتھیس روشنی کا پیغامبر اور پہلا انقلابی تصوّر کیا جاتا ہے۔ گویا "سنہری بدن" اسے پرومیتھیس کے روپ میں دیکھتی ہے۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آمریت یعنی فرد کی حاکمیت کے خلاف بھی ماضی میں جو لوگ برسرِ پیکار ہوئے انھوں نے بھی اپنا ہیرو پرومیتھیس ہی کو مانا اور اسی سے اپنی روشنی حاصل کی۔

ترانہ کے مترجم آصف فرخی نے اس کے شروع میں جو تعارفی کلمات تحریر کیے ہیں، ان سے آئین رینڈ کے شعور کی رَو اور اس کی ذہنی ساخت کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے اور یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آئین رینڈ ردِعمل کی ناول نگار ہے اور وہ اجتماعیت کے نظام سے ناپسندیدگی کی حد تک بیزار ہے۔

آئین رینڈ جب اپنے بے نام کردار سے یہ کہلواتی ہے کہ "میری تحریروں کا محرک و مقصد ایک آدرشی آدمی ہے" تو یہاں مجھے نیتشے کا "سپرمین"، رومی کا "مردِ کامل" اور دوسرے فارسی شعرا کا "مردِ تمام" اور علامہ اقبال کا "انسانِ کامل"

یاد آنے لگتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین رینڈ اپنے آدرشی آدمی کے لیے سرمایہ دارانہ نظام، رومانی دور کے احیا اور فرد کی بالادستی کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ یہ ایک دوسری انتہا ہے۔ اور ترانہ کا "آدرشی آدمی" دوسری انتہا کا فرد ہے جس کا مسکن خیالی دنیا ہے۔ میرے خیال میں کتنا ہی اچھا نظام کیوں نہ ہو اگر اس کے یہاں توازن نہ ہو اور وہاں خود احتسابی کے عمل کا فقدان ہو تو وہ انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ فردیت کا نظام ہو یا اجتماعیت کا

———— ا۔س

صدیوں کی زنجیر ———— مصنفہ: رضیہ فصیح احمد

صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

پتا: پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹، کراچی

"صدیوں کی زنجیر" رضیہ فصیح احمد کا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ المیۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ مصنفہ نے اسے قابلِ مطالعہ ناول بنانے کے لیے خاصی تگ و دو کی ہے۔ ناول کے مواد کی حصول یابی کے لیے اس المیے پر ملکی و غیر ملکی اخباروں کی خبروں کا سہارا لیا، سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں ہجرت کر کے آنے والے لوگوں تک رسائی حاصل کی اور آخر کار اس کام کے لیے ڈھاکے کا سفر بھی کیا۔ یوں بھی کسی عظیم سانحہ پر کوئی ناول گھر بیٹھ کے نہیں لکھا جا سکتا اگر سانحہ اس کے شہر یا اس کے ملک میں وقوع پذیر ہوا ہو تب بھی ضروری ہے کہ ممکنہ حد تک ہر طرح کے ذریعۂ اطلاع تک رسائی کی جائے اور ضرورت پڑے تو سانحہ کی جائے وقوع تک بھی بہ نفسِ نفیس پہنچا جائے۔

رضیہ فصیح احمد نے ناول کو موثر بنانے کے لیے اس کے دائرے کو المیۂ مشرقی پاکستان کے آغاز و انجام تک محدود نہیں رکھا۔ اس کے لیے وہ تقریباً ساڑھے سات سو برس پیچھے محمد بن بختیار خلجی کے زمانے میں گئی ہیں، اور اس کا رشتہ بختیار خلجی کے ہم رکاب ایک سپاہی قاسم خاں سے جوڑا ہے۔

کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ قاسم خاں پہلی شادی ایک بنگالی خاتون موکل سے کرتا ہے اور جلد ہی ایک رات یہ جانے بغیر کہ اس کی بیوی کے بطن میں اس کا بچہ پل رہا ہے، اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور پھر سرحد میں پہنچ کر ایک پہاڑی پر جھونپڑی آباد کر کے یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہاں اس کی دو شادیاں ہوتی ہیں۔ ناول کے دو اہم کردار شمس الرحمٰن اور زری جن کے سہارے پر ناول کا پھیلاؤ قائم ہے، ان میں شمس الرحمٰن موکل کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے کی نسل سے ہے اور زری سرحدی بیویوں میں سے کسی ایک کی اولادوں کی اولاد کی نسل سے۔ گویا ساڑھے سات سو برس بعد پھر قاسم خاں کی نسل کے دو افراد ایک دوسرے سے رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں

دیکھا جائے تو "صدیوں کی زنجیر" دو ابعاد کی کہانی ہے، جس کا ایک سرا مشرق میں اور دوسرا مغرب میں صدیوں سے پیوستہ ہے۔ ناول نگار نے نہایت چابک دستی سے ان ابعاد کے درمیان رہ کر واقعات کو آگے بڑھایا ہے۔ اس سفر میں سقوطِ ڈھاکہ، اس کا منظر اور پس منظر ناول کے رگ و ریشہ معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ہی ایسا اک آدھ مقام آیا ہو جہاں واقعہ کہانی سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہو۔

ناول نگاری کے میدان میں رضیہ فصیح احمد نوآمدہ نہیں ہیں۔ کوئی بھی مصنف ہو، نقشِ اوّل کی خامیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے نقشِ ثانی میں اس سے بچنے اور اسے بہتر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور رضیہ فصیح احمد تو اس اصول پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے نقشِ ستہ تک آپہنچی ہیں۔ لہٰذا فنّی طور پہ انھیں بہت موقع ملا ہے کہ اپنی خامیوں کو رفع اور اپنے فن کی تطہیر کر سکیں۔

بلاشبہ نقشِ ستّہ یعنی "صدیوں کی زنجیر" اس کی ایک کامیاب مثال ہے۔

کتاب مکتبہ اسلوب نے بڑے اہتمام سے چھاپی ہے۔　　　　ـــــ ا۔س

صلۂ شوق ـــــــــ مصنف: ابرار مجاہد

صفحات: ۱۰۸۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: مکتبہ عابد ۱۱۔جی ۳۸/۲۔ نیو کراچی

خالقِ کائنات خود جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

انسان اس کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا ہے ظاہر ہے نیابت کا تقاضہ یہی ہے کہ عکسِ جمیل بھی ہو اور آئینۂ جمال بھی۔ اس سوال کو سامنے رکھتے ہوئے ہر دور میں انسان نے جمال پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور اسی جمال پسندی کو عرف عام میں اگر شاعری کا نام دیا گیا ہے تو یہ بے جا نہیں۔ عصرِ حاضر میں جہاں بے شمار شعرا نے جمال پسندی کا اظہار نظم کی صورت میں کیا ہے وہاں ایک نام ابرار عابد کا بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ابرار عابد نے جمال پسندی کی روایت کے اظہار میں یوں بھی کیا ہے کہ: ؎

اپنے قدموں پہ فرشتوں کو جھکا سکتا ہے　　　　مرتبہ جان لے عابد اگر انسان اپنا

یوں لگا جیسے سماعت نے بصارت پالی　　　　پردۂ ساز سے جھلکا جو اس آواز کا رنگ

مہتاب کا چہرہ ہے کہ پرتو ترے رُخ کا　　　　اک عکس سرِ آبِ رواں دیکھ رہا ہوں

ہر طرف مہکے ہوئے ہیں اس کی یادوں کے گلاب　　　　آج میرے دل کا آنگن ہے گلستاں کی طرح

ابرار عابد اپنے فن کو جہاں جمال پسندی کا محور بناتے ہوئے ہیں وہاں زندگی کے اُن پہلوؤں کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں لذتِ کرب اور حلاوتِ حُزن بھی جمال پسندی کا لازمہ ہوتی ہے۔ غرض کہ کتاب اہلِ علم و دانش اور دنیائے جمال پسند میں یقیناً قبولیت حاصل کرے گی۔

ـــــ مختار اجمیری

مضمون صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک طرف لکھیں

گردوپیش

بابائے اردو یادگاری لیکچر

گزشتہ دنوں نیپا آڈیٹوریم میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے، روایت کے مطابق "بابائے اردو یادگاری لیکچر" کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ملک کے مشہور شاعر عزیز حامد مدنی نے "جدید اردو شاعری" کے موضوع پر اپنے طویل لیکچر کا خلاصہ پیش کیا، جسے انجمن جلد ہی کتابی صورت میں پیش کر رہی ہے۔ جناب عزیز حامد مدنی نے اپنے لیکچر میں ڈیڑھ سو سالہ ادبی عہد کو چھ حصّوں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر حصّے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

تقریب کی صدارت جناب اختر حسین رائے پوری نے فرمائی۔ اس موقع پر انجمن کے معتمدِ اعزازی جناب جمیل الدّین عالی اور مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اردو، پاکستان اور بھارت کے درمیان مضبوط لسانی پُل ہے

ممتاز شاعر ادیب اور دانشور جمیل الدّین عالی نے کہا ہے کہ بہت جلد پاکستان میں عالمی اردو کنونشن منعقد کیا جائے گا تاکہ اردو کی ترویج و ترقی کے ایک عالمی منظر نامہ کی تشکیل کے لیے کام ہو سکے۔ آل انڈیا ریڈیو کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ عالی جی کے ساتھ شریکِ گفتگو تھے۔ دونوں ہی ادیبوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اردو پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک مضبوط و مستحکم لسانی پُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ایک ایسا پُل ہے جس کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں اور محظوظ کر سکتے ہیں۔ عالی جی نے بتایا کہ وہ دو مشاعروں میں اور لکھنؤ میں ہونے والی فیض کانفرنس میں شرکت کے لیے بھارت آئے تھے۔ عالی صاحب نے کہا کہ لگتا ہے آئندہ پچاس برس میں کتاب ختم ہو جائے گی۔ کمپیوٹر کی مدد سے شاید کوئی میڈیا یا ٹیک وغیرہ وجود میں آجائے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں بڑی کلچرل اپیل ہے اور یہ کہ مشاعرے نے اب میگزین کا رول سنبھال لیا ہے۔ اس پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے وہ بڑی تعداد میں شاعری سے محظوظ ہوتے ہیں۔ عالی جی نے کہا کہ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں مطبوعات خاصی مشکل ہیں اور کم ہیں لیکن اردو کو زیادہ فروغ مشاعروں سے حاصل ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ بن گیا ہے جس کے ذریعے اپنی ثقافت کی شناخت کرائی جا سکتی ہے۔ دوہے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے

انھوں نے کہا کہ اب خاصے لوگ دوہے لکھنے لگے ہیں اور اس میں تجربات بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ پاکستان میں میرے ہی انداز کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے تو دراصل اپنی بھاشا الگ بنائی ہے۔ (جنگ ۱۵ اپریل ۸۸ء)

اردو کانفرنس کا مطالبہ

آل انڈیا اردو کانفرنس نے بھارتی حکومت پر زور دیا ہے کہ اردو کو صوبائی ضلعی اور تحصیل کی سطح پر سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ کانفرنس کی قرارداد جاری کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ اس زبان کو سو ملین بھارتی بولتے ہیں۔ چار روزہ کانفرنس اتوار کو یہاں ختم ہوئی۔ کانفرنس میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ سرکاری ذرائع ابلاغ اردو کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مطالبہ کیا کہ دور درشن پر طلبہ کے لیے اردو کے اسباق کے پروگرام پیش کیے جائیں۔ کانفرنس کا افتتاح اطلاعات و نشریات کے وزیر ایچ کے ایل بھگت نے کیا تھا۔ ڈاکٹر انجم نے اردو کے طلبہ کے لیے فیلوشپ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے حال ہی میں کم کر دیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور حیات اللہ انصاری سمیت متعدد دانشوروں نے حکومت پر زور دیا کہ اردو کو ان علاقوں میں جہاں وہ کثرت سے بولی جاتی ہے، دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ تعلیم بالغاں کے پروگرام کے تحت سرکاری ادارے اردو کو فروغ دیں۔ ڈاکٹر انجم نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر بہار کی حکومت کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کی انتظامیہ نے دارالحکومت میں اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے کوئی مثبت کارروائی نہیں کی۔

لکھنؤ میں فیض میلہ

بیگم فیض احمد فیض نے اتوار کو لکھنؤ میں سہ روزہ فیض انٹرنیشنل سمینار کا افتتاح کیا۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے عالمی امن اور اخوت کے لیے فیض کی خدمات کو سراہنے پر یہاں کے عوام کا شکریہ ادا کیا، اس تقریب کی صدارت جمیل الدین عالی نے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فیض کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا۔ غلام نبی آزاد، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، حسن کمال، افتخار عارف اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے علاوہ سوئیڈن، برطانیہ، روس اور پاکستان کے شاعروں نے اس سمینار میں حصہ لیا۔

یومِ پاکستان کے موقع پر نعتیہ تقریب

گزشتہ روز سرگودھا پی۔ اے۔ ایف ماڈل اسکول کے پرنسپل سید محمد تقوی کی میزبانی میں یوم پاکستان کے موقعے پر ایک نعتیہ تقریب منعقد ہوئی جس میں مقامی شعرائے کرام اسکول کے شعرا اور سرگودھا کے دانشور حضرات و معززین کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ الحاج مولانا اخگر سرحدی، صدر انجمن ترقی اردو سرگودھا نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اور پی۔ اے۔ ایف کے بیس کمانڈر ایئر کموڈور جناب علی الدین صاحب مہمانِ خصوصی تھے، اسٹیج کی نظامت آصف رانا نے انجام دی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے یوم پاکستان کی اہمیت پر دل پذیر تقریر فرمائی۔ اس کے بعد حضرت رشک ترابی، شاکر نظامی، سید واحد حسین نشاں، فقیر محمد صوفی اجمل ہاشمی، ممتاز عارف، ظہیر الدین ظہیر، نصرت چوہدری، پروانہ شاہ پوری اور صاحبِ صدر نے بہ حضور سرورِ کائنات اپنے گل دستہ ہائے عقیدت پیش کیے۔ آخر میں سید محمد تقوی نے عشائیہ دیا اور یوں محفلِ نعت ثواب و سرور کے ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔

قراردادِ پاکستان

انجمن ترقی اردو خواتینِ پاکستان نے جمعہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو قراردادِ پاکستان کے سلسلے میں ایک جلسہ تبلیغی ہال سوسائٹی میں منعقد کیا۔ صدارت بیگم شریف صاحبہ نے فرمائی۔ تلاوتِ قرآنِ پاک کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا۔ محترمہ سیدہ عثمانی صاحبہ، محترمہ خورشید بانو شمع صاحبہ، محترمہ فاطمہ صاحبہ، محترمہ اختر جہاں صاحبہ، محترمہ بیگم نصیر صاحبہ، بیگم صمد خان صاحبہ، محترمہ کوثر جہاں صاحبہ اور بیگم سمیع اللہ صاحبہ نے تقریریں کیں۔ سب نے پاکستان جیسی نعمت حاصل ہونے پہ خداوند تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمیں پاکستان کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ ایک اسلامی مملکت ہے۔ یہاں اسلام کی بالادستی قائم رہنا چاہیے۔ اور ہم سب بہنوں کا یہ اوّلین فرض ہے کہ اپنی اولادوں کو وطن سے محبّت، اسلام سے محبّت اور مسلمانوں سے محبّت کرنا سکھائیں اور اپنے بچّوں میں وہ عزم و ہمّت اور حوصلہ پیدا کریں کہ وطن عزیز کی بقا اور سلامتی کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیں۔ محترمہ اختر جہاں نے ۲۳ مارچ کے سلسلے میں ایک نظم پڑھی۔ بیگم رعنا ظریف کی نظم محترمہ سیدہ عثمانی صاحبہ نے پڑھ کر سنائی۔ آخر میں محترمہ بیگم شریف صاحبہ نے اپنے گراں بہا خیالات سے نوازا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ کس طرح انھوں نے اور ان کی ساتھیوں نے مسلم لیگ اور حصولِ پاکستان کے لیے جد و جہد کی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایک پاک وطن عطا کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ انھیں فخر ہے کہ یہاں بھی خواتین کی بہت سی انجمنیں اور ادارے پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔

بیگم سیدہ عثمانی۔ خازن: انجمن ترقی اردو خواتینِ پاکستان

جوش ملیح آبادی کی چھٹی برسی

گزشتہ دنوں مقامی ہوٹل میں جوش میموریل کمیٹی کراچی شاخ کی طرف سے حضرت جوش ملیح آبادی کی چھٹی برسی منائی گئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی اسپیکر سندھ اسمبلی سیّد مظفر حسین شاہ نے حاضرین سے جوش کی اہمیت پہ خطاب کیا۔ جناب یوسف جمال نے جوش صاحب کی سوانح حیات شائع کرنے کی ضرورت پہ زور دیا۔ جناب رئیس امروہوی کی پیش کردہ ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ کراچی یونیورسٹی میں جوش کے افکار پہ ڈاکٹریٹ کی سند جاری کی جائے اور وہاں ایک جوش چیئر بھی قائم کی جائے۔

اس موقع پہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب سحر انصاری، جناب محمد علی صدیقی، بھارتی صحافی جناب انیس دہلوی، ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی، جناب حسین مہدی، پیر مختار جان سرہندی، بیگم مبشّرہ تالپور، سیّد محمد تقی، پیر مانکی شریف، راغب مراد آبادی، جناب اختر فیروز اور جوش مرحوم کی پوتی محترمہ تبسّم اخلاق نے شاعرِ انقلاب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پیر صاحب مانکی شریف حکیم محمد سعید اور چینی پریس قونصل بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ تقریب کی صدارت جوش مرحوم کے فرزند جناب سجّاد حیدر خروش نے کی۔

محمد علی صدیقی پروفیسر ہو گئے

معروف نقّاد محمد علی صدّیقی جو پیشہ کے لحاظ سے صحافت سے منسلک تھے، اب تدریس سے متعلق ہو گئے ہیں۔ گزشتہ ماہ ان کا تقرر جامعہ کراچی کے شعبۂ "مطالعاتِ پاکستان" میں ہو گیا۔ اور اب وہ ان دنوں پوری دل چسپی کے ساتھ اپنی تدریسی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔

حروفِ تازہ

خطوط رشید احمد صدیقی ——— مرتب: لطیف الزماں خاں
(مکتوبات)
صفحات: ۳۰۰ - قیمت: ۷۰ روپے
پتا: مجلسِ ادبیاتِ مشرق ۳ ڈی ۹/۲۴ ناظم آباد، کراچی ۱۸

اقبالیات کی مختلف جہتیں ——— مصنف: یونس جاوید
(اقبالیات)
صفحات: ۳۸۴ - قیمت: ۷۵ روپے
پتا: بزمِ اقبال ۲ کلب روڈ، لاہور

تذکارِ اقبال ——— مصنف: منشی محمد الدین فوق، مرتب: محمد عبداللہ قریشی
(اقبالیات)
صفحات: ۲۷۵ - قیمت: ۴۵ روپے
پتا: بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور

ادب و فن ——— مصنف: ڈاکٹر سید عبداللہ
(تنقید)
صفحات: ۳۲۶ - قیمت: ۹۰ روپے
پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

جوانی کی دہلیز پر ——— مصنفہ: شمشاد نازلی
(شاعری)
صفحات: ۱۴۴ - قیمت: ۵۰ روپے
پتا: "سلسلہ" پوسٹ بکس نمبر ۱۲۴۲ - پشاور

مندر میں محراب ——— مصنف: محمد اجمل نیازی
(سفرنامہ)
صفحات: ۲۷۲ - قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: پولیمر پبلی کیشنز اردو بازار - لاہور

عالم میرے دل کا ——— مصنّف: جاوید صبا
(شاعری)
صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: مکتبہ نگارش بلاک ۱۱۔اے مکان ۴۹۹، اے ناظم آباد کراچی۔ ۱۸

پاکستان، امریکہ کے چنگل میں ——— ترجمہ و انتخاب: اقبال خان
(سیاسیات)
صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: نگارشات۔ میاں چیمبرز، ۳۱ ٹمپل روڈ۔ لاہور

جب زمین پر کوئی دیوار نہ تھی ——— مصنّف: عارف شفیق
(شاعری)
صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار۔ کراچی

مقدمۂ سحر و ساحری ——— مصنّف: جمیل نظر
(تنقید)
صفحات: ۲۱۲۔ قیمت: ۴۵ روپے
پتا: شیوا اکیڈمی النور سوسائٹی۔ کراچی

عرب و ہند کے تعلقات ——— مصنّف: علامہ سیّد سلیمان ندوی
(تاریخ)
صفحات: ۳۴۶۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

غالبؔ۔ فن و شخصیت ——— مصنّف: علامہ نیاز فتح پوری
(تنقید)
صفحات: ۲۲۰۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

بیسویں صدی میں اُردو غزل ——— مصنّف: علامہ نیاز فتح پوری
(تنقید)
صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

بیتال پچیسی ——— ترتیبِ نو: پروفیسر سیّد وقار عظیم
(کہانیاں)
صفحات: ۸۷۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

دائرے ——— مصنّف: رحیم صدیقی عیاں
(شاعری)
صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۳۰ روپے
پتا: ۹/۲، اے ایریا، لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

جنوری ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۸۷ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

نئے خزانے

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

تاریخ و سیاست

مقبول احمد، مفتی	مسئلہ سندھ اور استحکام پاکستان	میثاق، لاہور	جولائی	۱۹۸۷ء	ص ۱۷
مقبول احمد قریشی	نفاذِ اسلام اور دانشوروں کا کردار	چٹان، "	۷؍ دسمبر	"	ص ۲۰
میر بادشاہ، سیّد	تحریک مجاہدین اور انگریز	ترجمان حق، لاہور	جولائی	"	ص ۶
ناصر مکارم شیرازی	اسلامی سیاست اور کتاب و سنّت میں اس کی بنیادیں	توحید، ایران	مئی، جون	۱۹۸۷ء	ص ۲۷
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	مدینہ منوّرہ ــ اسلام کا گہوارہ	الہام، بہاولپور	۷؍ نومبر	"	ص ۵
ناظم ندوی، مولانا	جہادِ افغانستان اور عالم اسلام کی ذمّہ داری۔	تعمیرِ حیات، لکھنؤ	۱۰؍ جولائی	۱۹۸۷ء	ص ۱۰
			۲۵؍ "	"	ص
نظام الدین	جیکب آباد پر مشائخ کرام کے سیاسی اثرات	اظہار، کراچی	جنوری، فروری	۱۹۸۷ء	ص ۳۶
نکہل چکرورتی	میرٹھ کی خوں چکاں داستان	تعمیرِ حیات، لکھنؤ	۱۰؍ جولائی	"	ص ۹
یونس نگرامی، ڈاکٹر محمد	ہندوستان میں اسلامی تشخص کی تشکیل و حفاظت میں مسلمانوں کی کاوشیں۔	تعمیرِ حیات، لکھنؤ	۲۵؍ اکتوبر	۱۹۸۷ء	ص ۸
یونس نگرامی، ڈاکٹر محمد	ہندوستان میں اسلامی تشخص کی تشکیل و حفاظت میں مسلمانوں کی کاوشیں	تعمیرِ حیات، لکھنؤ	۱۰؍ نومبر	۱۹۸۷ء	ص ۱۲
—	خانۂ کعبہ کے تقدس کی پامالی	تکبیر، کراچی	۷؍ ستمبر	"	ص ۱۱
—	مظفر آباد کی تاریخ	انصاف، راولپنڈی	۱۲؍ اگست	"	ص ۶
—	میثاقِ مدینہ	صوتِ اسلام، فیصل آباد	نومبر، دسمبر	"	ص ۳۵

تعلیم—تاریخ و مسائل

حامد، سید	مدارس اور سائنسی تعلیم	آموزگار، جلگاؤں	جولائی	۱۹۸۷ء	ص ۶
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر	درسی کتب میں ٹیکنیکل ایڈیٹنگ	العلم، کراچی	اپریل تا جون، جولائی تا ستمبر	۱۹۸۷ء	ص ۸۰
خالد اکبر خان کیانی، راجہ	نظامِ تعلیم کی ضرورت	بنّیات، "	اگست	"	ص ۵۱
رحمت فرخ آبادی، پروفیسر	ہمارا نظامِ تعلیم اور تاریخ	العلم، "	اپریل تا جون، جولائی تا ستمبر	"	ص ۱۰۷
شمس تبریز خاں، مولانا	مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نظریۂ تعلیم	الولی، حیدرآباد	ستمبر، اکتوبر	"	ص ۲۸
عبدالحق، شیخ الحدیث مولانا	دینی مدارس و مساجد	الحق، اکوڑہ خٹک	ستمبر	"	ص ۸
عبدالرشید نوشہروی، پروفیسر	اسلامی مملکت پاکستان کے تعلیمی مقاصد	العلم، کراچی	اپریل تا جون، جولائی، ستمبر	"	ص ۳۷
عبدالقیوم حقانی، مولانا	فضلائے مدارس عربیہ کے لیے جامع منصوبہ بندی کی ضرورت	الحق، اکوڑہ خٹک	جولائی	۱۹۸۷ء	ص ۲۰
غلام حیدر رایم۔ اے ملک	عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم	شمس الاسلام، بھیرہ	دسمبر	"	ص ۱۰
وقار احمد رضوی، ڈاکٹر	اعلیٰ تعلیم مقاصد و مسائل	العلم، کراچی	اپریل تا جون، جولائی، ستمبر	"	ص ۱۲۸

ثقافت اور فنونِ لطیفہ

تاراچند، ڈاکٹر	ہندوستانی کلچر کا ارتقا تاریخ کے آئینے میں	نگار، کراچی	جون	۱۹۸۷ء	ص ۱۳
ثاقبہ رحیم الدین	عشقِ ثقافت	" "	ستمبر	"	ص ۴۵
شوق، ڈاکٹر نواز علی	سرمین کلیان کا مطالعہ	اظہار، "	جنوری، فروری	"	ص ۴۰
مجاہد، پروفیسر ثناء اللہ	سندھ میں اسلامی ثقافت کے مراکز	الولی، حیدرآباد	مئی، جون	"	ص ۳۳
نیر مسعود	اودھ کی تہذیبی تاریخ کا ایک غیر متوقع ماخذ	قومی زبان، کراچی	جولائی	"	ص ۴۵

خودنوشت

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	رفت و بود	تہذیب، کراچی	نومبر	۱۹۸۷ء	ص ۹۴
			جولائی	"	ص ۱۸
احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ	عمرِ رائیگاں	نگار، کراچی	ستمبر	"	ص ۵
خلیق ابراہیم خلیق	میرے لڑکپن اور نوجوانی کا لکھنؤ	افکار، "	"	"	ص ۲۱
قدرت اللہ شہاب	آئی سی ایس میں داخلہ	قومی زبان، کراچی	جولائی	"	ص ۱۵

کوثر القادری	سفرِ زندگی	الانسان، کراچی	کتوبر	۱۹۸۷ء ص ۱۸
〃	〃	〃 〃	نومبر	〃 ص ۳۱
محمد زبیر، الحاج	علی گڑھ میں میرے بیالیس سال	〃 〃	〃	〃 ص ۲۶
یونس احمر	بہارِ آخر شد	افکار، 〃	اگست	〃 ص ۵۱

سیر و سیاحت

صلاح الدین محمد	برطانیہ میں آٹھ دن	تکبیر، کراچی	۸ر اکتوبر	۱۹۸۷ء ص ۱۳
〃 〃	مشاہداتِ ترکی: سفرِ ترکی ایک خواب جو پورا ہو گیا	تکبیر، کراچی	۱۹ر نومبر	۱۹۸۷ء ص ۸۰
〃 〃	مشاہداتِ ترکی: اتاترک اور قائداعظم	〃 〃	دسمبر	〃 ص ۱۲
〃 〃	مشاہداتِ ترکی	〃 〃	۲۴ر دسمبر	〃 ص ۸۶
عبدالستار، نعیم	پاکستان سے سرزمینِ مقدس تک (سفرنامہ)	صوت الاسلام، فیصل آباد	اگست	〃 ص ۷
غلام الرحمٰن، مولانا مفتی	حقانیہ سے اذہر تک	الحق، اکوڑہ خٹک	ستمبر	〃 ص ۵۱
محمد تقی عثمانی، مولانا	احد سے قاسیون تک	البلاغ، کراچی	دسمبر	〃 ص ۱۳
			جولائی	〃 ص ۴۱
			اگست	〃 ص ۳
			اکتوبر	〃 ص ۱۹
			نومبر	〃 ص ۱۹
محمد سلیمان خاں	کراچی مونٹریال کراچی	آئین، لاہور	۱۵ر اگست	〃 ص ۳۲
〃	〃	〃 〃	۱۵ر ستمبر	〃 ص ۳۰

شخصیات

غالب دہلوی

شمس الرحمٰن، فاروقی	انداز گفتگو کیا ہے	اردو، کراچی	جنوری تا مارچ	۱۹۸۷ء ص ۳۷
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	روداد مقدمۂ غالب	〃 〃	〃	〃 ص ۵
کوکب شادانی	تشریحاتِ کلامِ غالب	سب رس، 〃	ستمبر	〃 ص ۲۰
نیاز فتحپوری، علامہ	میرا اوّلین تعرّف غالب سے	نگار 〃	نومبر	〃 ص ۱
〃	غالب کا طرزِ شاعری	〃 〃	〃	〃 ص ۵

نیاز فتحپوری، علامہ	غالب کی شاعرانہ خصوصیات	نگار، کراچی	نومبر	۱۹۸۷ء	ص ۹
〃 〃	غالب ولی بادہ خوار ہوتا	〃 〃	〃	〃	ص ۵۷
〃 〃	غالب کا نہاں خانۂ ازل	〃 〃	〃	〃	ص ۶۶
〃 〃	مثنوی اور غالب کی مثنوی نگاری	〃 〃	〃	〃	ص ۷۱
〃 〃	غالب کا آہنگ ولب ولہجہ	〃 〃	〃	〃	ص ۱۰۴
〃 〃	غالب اور الہامی شاعری	〃 〃	〃	〃	ص ۱۱۲
〃 〃	غالب اور شاعری کا معیارِ حقیقی	〃 〃	〃	〃	ص ۱۱۶
〃 〃	غالب اور بیدل	〃 〃	〃	〃	ص ۱۱۹
〃 〃	غالب اور مومن کی فارسی ترکیبیں	〃 〃	〃	〃	ص ۱۲۳
〃 〃	مشکلاتِ غالب (شرح دیوانِ غالب)	〃 〃	〃	〃	ص ۱۲۷
〃 〃	انتخابِ کلام	〃 〃	〃	〃	ص ۲۰۷

علامہ اقبال

آصف فرخی	ہائیڈل برگ میں آثارِ اقبال	قومی زبان، کراچی	نومبر	۱۹۸۷ء	ص ۹
بدیع الزماں، محمد	اقبال کی نوائے پریشاں	فاران،	اپریل	〃	ص ۳۶
〃 〃	اقبال کے کلام کی چند قرآنی اصطلاحات	آموزگار، جلگاؤں	جولائی	〃	ص ۱۱
حسن اختر، ڈاکٹر ملک	علامہ اقبال اور پنجاب یونیورسٹی	اردو، کراچی	اپریل تا جون	〃	ص ۵
خیال امروہوی، ڈاکٹر	اقبال کے نظامِ فکر میں سائنس کا مقام	شام وسحر، لاہور	نومبر	〃	ص ۲۱
رفیع الدین، ڈاکٹر محمد	حکمتِ اقبال	حکمتِ قرآن	اگست	〃	ص ۵۳
		〃 〃	ستمبر	〃	ص ۳۵
		〃 〃	اکتوبر	〃	ص ۴۷
		〃 〃	دسمبر	〃	ص ۴۷
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	اقبال پر ڈاکٹر درّانی کی تحقیق	سب رس، کراچی	نومبر	〃	ص ۳۷
رفیق محمد خاں	علامہ اقبال بحیثیت ماہرِ تعلیم	قومی زبان،	جولائی	〃	ص ۷۷
سرور، اکبر آبادی، ڈاکٹر	اقبال کی نعتیہ شاعری	انجمن،	اکتوبر	〃	ص ۱۵
صابر جلیسری، ڈاکٹر	فکر اقبال کا ایک اہم پہلو	قومی زبان	نومبر	〃	ص ۱۷
طاہر فاروقی مرحوم، ڈاکٹر محمد	اقبال کا کلام قرآنِ حکیم کی روشنی میں	فاران، کراچی	اپریل	۱۹۸۷ء	ص ۶

کلیم اختر	علامہ اقبال کا فکری کردار اور عمل	چٹان، لاہور	۱۴ر نومبر	۱۹۸۷ء ص ۹
ماہر القادری	علامہ اقبال سے میری پہلی اور آخری ملاقات	فاران، کراچی	مئی	۱۹۸۷ء ص ۱۵
محمد شفیع	اقبال کا بچپن	شام و سحر، لاہور	نومبر	〃 ص ۸
مسعود حسین، ڈاکٹر	" اقبال کی نظری و عملی شعریات	نگار، کراچی	اگست	〃 ص ۱۳
محمد منوّر، پروفیسر	وجدانِ اقبال کی فتوحات	تکبیر، 〃	۱۲ر نومبر	〃 ص ۳۵
مہر، مولانا غلام رسول	عظمت موت کے دروازے پر (علامہ اقبال)	چٹان، لاہور	۱۴ر 〃	〃 ص ۱۱
نذیر مومن	اقبال کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر	شام و سحر، 〃	نومبر	〃 ص ۱۱
یوسف سلیم چشتی	اقبال اور عشقِ رسول	وجدان، کراچی	〃	〃 ص ۲۱

بابائے اردو مولوی عبد الحق

ابو الکلام قاسمی، ڈاکٹر	مولوی عبد الحق	قومی زبان، کراچی	اگست	۱۹۸۷ء ص ۳۷
اسلم فرخی، ڈاکٹر	بابائے اردو کے خطوط	〃 〃	〃	〃 ص ۱۱
شاعر، حمایت علی	نورانی شخصیت	〃 〃	〃	〃 ص ۴۹
مسعود حسن ہاشمی	کچھ عرصہ بابائے اردو کے ساتھ	〃 〃	〃	〃 ص ۱۲۰
نرگس عظیم	مولوی عبد الحق کی ذہنی تشکیل کا پس منظر	〃 〃	〃	〃 ص ۵۹
〃 〃	مولوی عبد الحق کی ادبی زندگی کا تاریخی جائزہ	〃 〃	〃	〃 ص ۷۵
ہاشم رضا	ایک خط	〃 〃	〃	〃 ص ۲۵

خواجہ احمد عبّاس

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر	انسان دوست ادیب	افکار، کراچی		۱۹۸۷ء ص ۱۸
حنیف قوق، ڈاکٹر	خواجہ احمد عبّاس۔ حقیقت اور کہانی	〃 〃	اگست	〃 ص ۱۳
خواجہ احمد عبّاس	آئینہ خانے میں	〃 〃	〃	〃 ص ۳۸
〃	باقی کچھ نہیں	〃 〃	〃	〃 ص ۴۵
صہبا لکھنوی	مختصر حالات زندگی (خواجہ احمد عبّاس)	〃 〃	〃	〃 ص ۱۰
ضمیر نیازی	خواجہ احمد عبّاس۔ چند یادیں، چند باتیں	〃 〃	〃	〃 ص ۳۴
محمد علی صدیقی	خواجہ احمد عبّاس۔ ایک شخصیت ایک انجمن	〃 〃	〃	〃 ص ۳۱
وجید انور	باچھو صاحب جنھیں کوئی نہیں جانتا	〃 〃	〃	〃 ص ۲۴
〃	خواجہ احمد عبّاس کے آخری لمحات	〃 〃	〃	〃 ص ۲۰

اشرف صبوحی

اسلم فرخی، ڈاکٹر	بھائی ولی	قومی زبان، کراچی	اکتوبر ۱۹۸۷ء	ص ۱۲
انتظار حسین	کھرچن کا آخری دانہ	" " "	"	ص ۱۱
صادق الخیری	یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ	" " "	"	ص ۱۷

شورش کاشمیری

ابراہیم بندھانی، محمد	قافلہ حریت کا سرفروش مجاہد	چٹان، لاہور	۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۷	ص ۱۱
ابن حسن، سید	شورش کاشمیری	" "	۷ر نومبر "	ص ۳۳
جمیل احمد کیانی، ڈاکٹر	آغا شورش کاشمیری سے چند ملاقاتیں	" "	۱۴ر " "	ص ۲۳
شورش کاشمیری	آغا جی کی محنت کا ثمر	" "	۲۰ر اکتوبر "	ص ۹
عامر عبدالحکیم	بطلِ حریت شورش کاشمیری	" "	" " "	ص ۳۳
کلیم اختر	آغا شورش کاشمیری	" "	" " "	ص ۱۴

فیض احمد فیض

احمد عباس، خواجہ	فیض کا فیض	روحِ ادب، کلکتہ	اکتوبر ۸۲ء تا ستمبر ۱۹۸۷ء	ص ۳۲
اردن کمار	فیض ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ	" "	" " "	ص ۲۲۴
جاوید نہال، ڈاکٹر	فیض کا غالب سے رشتہ	" "	" " "	ص ۱۴۲
حسن عباس، سید	فیض کا مرثیہ گوئی	" "	" " "	ص ۲۰۸
حبیب احمد عثمانی	فیض بحیثیت نثر نگار	" "	" " "	ص ۲۳۵
خالدہ حسینی	فیض احمد فیض ۔ بعض خواتین کی نظر میں	" "	" " "	ص ۲۵۳
خورشید عیسیٰ	ترقی پسند ادب کے محرکات ۔ فیض	" "	" " "	ص ۲۴۲
رازاٹاری، شفیع اللہ خان	عہد آفریں شاعر ۔ فیض	" "	" " "	ص ۲۱۴
رام لعل	فیض کی مقبولیت میں جیل کا ہاتھ	" "	" " "	ص ۱۱۸
دوراں، اویس احمد	ایمائی لہجہ کا شاعر	" "	" " "	ص ۱۵۹
ساحل احمد	فیض کی غزل گوئی	" "	" " "	ص ۲۱۹
شبانہ نسرین	فیض ۔ ایک آفاقی شاعر	" "	" " "	ص ۱۳۸
شمس الرحمٰن فاروقی	فیض اور کلاسیکی غزل	قومی زبان، کراچی	نومبر	" ص ۴۵
عبدالرؤف، ڈاکٹر	فیض احمد فیض اور اقبال	روحِ ادب، کلکتہ	اکتوبر ۱۹۸۷ء تا ستمبر	" ص ۱۳۲

عبدالقیوم ابدالی، ڈاکٹر	مہ و سال کی آشنائی	روحِ ادب، کلکتہ	اکتوبر ۱۹۸۶ء تا ستمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۹۹
عبدالمنان، ڈاکٹر	فیضؔ کی نثر	〃 〃 〃 〃 〃	ص ۱۶۸
عتیق احمد	فیضؔ کے سمت فکر اور ذہنی سفر	〃 〃 〃 〃 〃	ص ۹۸
فتح محمد، ملک	فیضؔ — صوفی مومن اور اشتراکی مسلم	نیا دور، کراچی	جولائی ۱۹۸۷ء ص ۴۴۶
فکر تونسوی	فیضؔ کے نام خط	روحِ ادب، کلکتہ	اکتوبر ۱۹۸۶ء تا ستمبر 〃 ص ۱۱۰
قمر رئیس، پروفیسر	فیضؔ کی قید و بند کی شاعری کے تناظرات	روحِ ادب، کلکتہ	اکتوبر ۱۹۸۶ء تا ستمبر ۱۹۸۷ء ص ۸۷
کہکشاں پروین	فیضؔ احمد فیضؔ — ایک مطالعہ	روح ادب، کلکتہ	〃 〃 〃 〃 ص ۲۴۸
محمد امین	فیضؔ سے چند ملاقاتیں	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۱۲۶
ممتاز حسین پروفیسر	فیضؔ کی شاعری	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۱۶
میلاوسیلووا، ڈاکٹر	وہ جب آئے ہیں مائل بہ کرم آئے ہیں	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۹۰
نصر، غزالی	فیضؔ کا شعری کردار	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۱۶۷
نورالہدیٰ	فیضؔ کا ذہنی سفر	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۱۸۶
ہارون الرشید	فیضؔ کی شاعری	〃 〃 〃 〃 〃	〃 ص ۱۵۴

اقوال و امثال

از

سیّد یوسف بخاری

(زیرِ طبع)

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ — کراچی ۱

Regd. M. No. 270

Phone: 724023

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

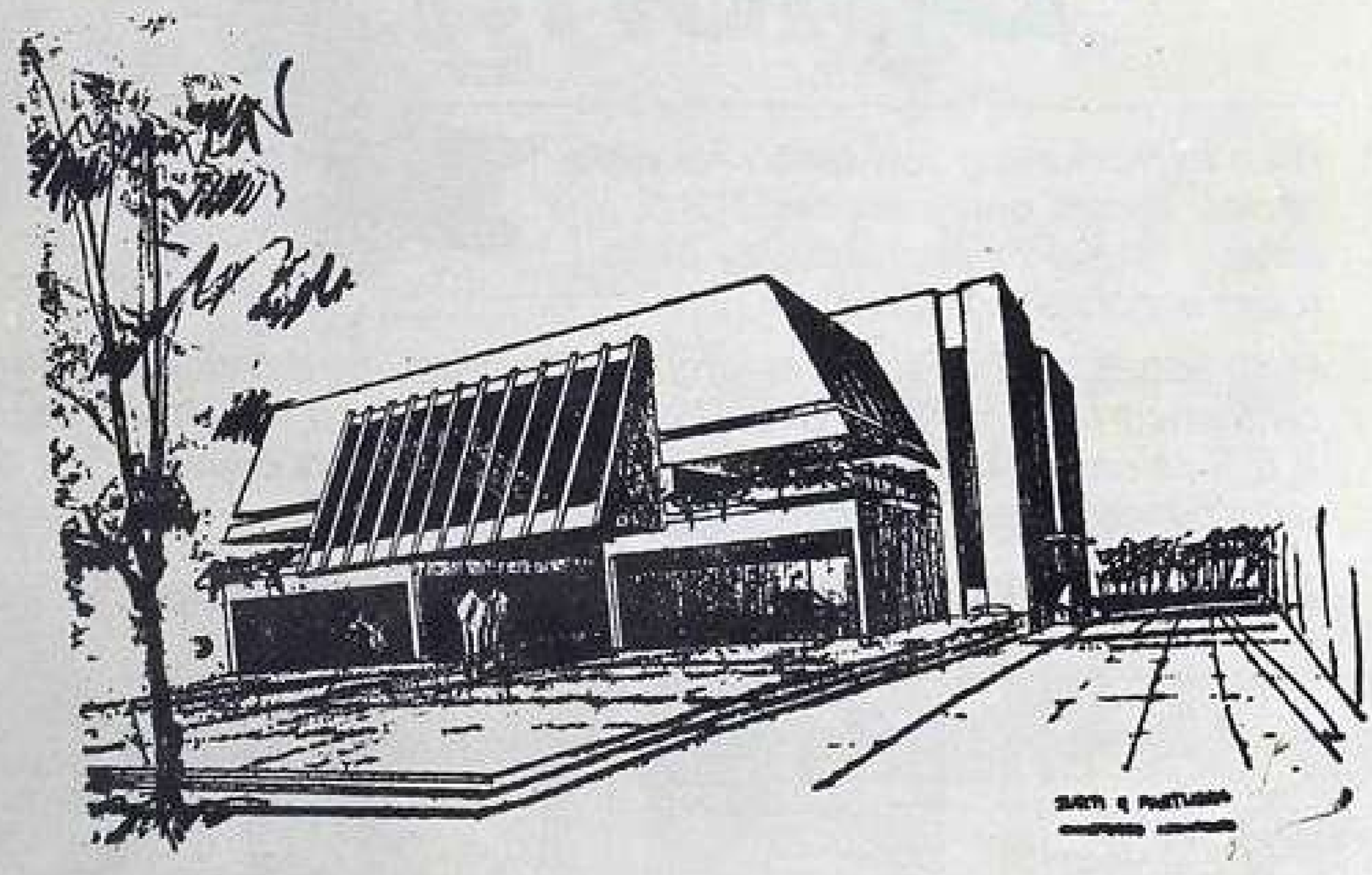

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -